

جامِ وِگ



از
سید کاظم نقاوی

کتابخانه

ناشر: منیر قصر الادب جگواہ تحصیل شجاع آباد ضلع ملتان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ما فیہ

● توطیہ سخن

● انتساب

● غبد

● افسانہ و افسوں

● ممد اول کلام

● زبان

● بشنوازے

● اختتامیہ

نغمہ کجاو من کجا سازِ سخن بہسانہ الیت
سوئے قطارِ می کشم ناقہ بے مہارِ ادا

بیادگار

شانہوں کی شادابی بڑ پر موقوف ہے
اگر درختوں کی بڑ سلامت ہے، تو
شانہوں اور پتوں کے مڑ جھانے سے باغ
نہیں اُجڑ سکتا۔ سات ٹہنیاں کاٹ دی
جائیں گی تو ستر ہزار نکل آئیں گی !

رنگے اگر چات و کفیت۔!
 قرن و در اجمہ مدتے۔!
 آف و شیاں میرت نبیت۔!

شومی قسمت سے گر سنگ گراں
 گر پڑے دریا کے اندر ناہیاں
 اور رہے برسوں وہیں تو کیا اُسے
 پیس لکنا ہے بھلا آبِ رواں

(یہ کتاب ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان کے 1963ء کے شماروں میں
 شامل ہے جن کو ضلع لکھنؤ محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کتب چھپی ہے
 سال و افروز ہے۔) - 1 - حیدر اللہ بلوچی دنیا کی جانب
 سے شائع کیا گیا اور 1963ء کے شماروں میں شائع ہوا ہے
 کراچی 3 اگست 2012ء

توطیہ سخن

میرے خیال میں ناظرین کرام کو یہ بتادینا مناسب ہے کہ آج میں جام و ترک کا ذکر کیوں چھیڑ رہا ہوں جبکہ اس عظیم المرتبت شاعر پر جو کچھ کہنا تھا، کہا جا چکا ہے۔ اور اس کی زندگی یا شاعری کا کوئی نیا پہلو منصف شہر و پر جلوسہ گر نہیں ہوا ہے۔ اس کی اولین وجہ تو یہ ہے کہ مجھے اس کے ذکر میں مزہ ملتا ہے جب میں نے مکتب میں قدم رکھا تھا تو اردو، فارسی اور عربی کی بولیوں کی سنی تھیں۔ ان زبانوں سے شناسائی ہو گئی تھی اور جب مکتب سے قدم باہر نکالا تو انگریزی زبان و ادب سے متعارف ہوا۔ اللہ اس کے مقدر سے رحمہ بعد تسکرت اور جو میں سے آنکھیں چاڑھوئیں۔

شعر و سخن ورثے میں ملا تھا۔ بچپن ہی سے لطف لینے لگا۔ مقدمہ مقدار میں اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی کے اشعار اور دوسرے نوک زبان رہنے لگے۔ لیکن جب ۱۹۴۹ء کے موسم بہار میں حسن اتفاق سے کوئٹہ آنا ہوا تو میری گویائی سلب ہو گئی۔ ایک نئی آواز سنی، اور جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب کچھ بھول گیا۔

شام کا وقت تھا، ہم دفتر استقلال میں بیٹھے تھے۔ محمد درانی، گل خاں نعیر، محمد اعظم اچکنی اور میں — ایک نواؤ غیب شہر۔ چائے کا دور ختم ہوا تو شعر و سخن کا جام گردش میں آگیا۔ گل خاں نعیر نے اردو اور فارسی کلام سے تواضع کی۔ کچھ میں نے سنایا۔ محمد درانی نے پکے راگ کے چند بولوں سے مدارت فرمائی۔ ہم ہلک ہلک اُٹھے۔ اتنے میں طنز سے کاتار تھرکاتا ہوا کوئی گویا گزرا۔ گل خاں نے بیٹھے ہی بیٹھے آواز لگائی۔ دل نشین گونج کے ساتھ گویا دفتر کی پرانی جیٹا اٹھا کر اندر چلا آیا۔

”کچھ سناؤ“ — گل خاں نے کہا، اردو وہ طنز سے کہے تا ردل کو پڑھاتے، اُٹاتے پہنے کے بعد زخمزدن ہوا۔ نوائے شوق ساد سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی،

ہلکے اگر چات و کیفیت
قرن و دراجے مدتے
آف و نیلاں ہیرت نبیت

سماں بندھ گیا۔ گل خاں سر دھنسنے لگا۔ ساد کی نے بدلی، اب کوئی زرمیہ داستان شروع تھی، آنکھوں کے سامنے گھوڑوں کے دوڑنے اور فوجوں کی بیچارہ کا نقشہ تھا۔ نوا سے نوا رہا لڑی تھی۔ محنتوں گزرنے کے بعد اسلحہ قراق کے عالم میں گل خاں نعیر کی

پرسوز آمد از لبِ مہرئی

دستِ نصیر خانِ دلی
ہٹتی نہیان آن تڑکے
آئینہ نے دے دی گئے
پگہ نے وارِ کس بُرے

میں عالمِ مستی میں پکارا اٹھا:

”پگہ نے وارِ کس بُرے“

دلِ مادی باری آئے گی

کسی نے سرگوشی کی۔ زبان سمجھتے ہیں۔ اور میں حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ دنیا کی زبان ایک ہے۔ پھر عشق کی زبان اور
حسن کا تو عالم عالمِ سُرخِ خونِ تمنا کا شاہد و مہتر ہے۔ زبان محض ایک مادی پیکر ہے۔ اس کثافت میں روحِ لطافت جلوہ پیرا
ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو صاحبِ دل ہیں، وہ شریعتِ زبان کی ظاہر پرستیوں سے آلودہ دامن نہیں ہوتے۔ جام کی آواز میرے
قلب کی پہنائیوں میں موجود تھی۔ میرے دل کی مدائے شوق سے ہم آہنگ ہو گئی اور غلبہٴ قند جو کہ فرمائی ہے میری طبعِ سیاب
صفت کو بلوچوں کی جانب مائل کر دیا۔ بلوچستان ان کہیں کی تشیل سے لے کر مارشل لار کے نفاذ تک اس عشق میں دلِ نازاں
کیا گزری، یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہے

وہ کون سا ہے ستم جس کی انتہا نہ ہوئی، نظرِ محکم نہ مری، ہاں بھی خط نہ ہوئی
اداسِ آج احاطہٴ قبرستان کی ایک خلوت میں جو اس عشق میں گزر رہا ہے۔ اس کا بھی اخفا مناسب نہیں۔ ہاں اس امر کا اعتراف ناگزیر
ہے کہ کل بھی جام بن درک نے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا تھا اور آج بھی وہی پارہٴ دل کی تسکین کا باعث ہے۔

بگئے اگر چات و کیفیت

قرنِ دراجے مدتے

آف و نیلاں میرت نیت

پھر میں پندرہ سال تک بلوچوں کی روح کو دُورِ مذہبِ تار ہا ہوں۔ اُسے پایا ہے۔ اُسے سینے سے لگایا ہے۔ اردو اور انگریزی زبان
حضرات کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جام بن درک پر کچھ نہ لکھ سکا۔ وہ جام بن درک جس نے مجھے بلوچی زبان و ادب کی جانب
مائل کیا۔ بلوچ اور بلوچستان کی دریافت کیلئے انگیخت کیا۔ وادی و صحرا کی خاک چھنوائی۔ لہذا میں ناخن کا قرض بھی اتنا نہ چاہتا تھا۔
پھر گزشتہ سال جنگل اکاڈمی کا ایک دعوت نامہ ملا کہ کسی دو بلوچی زبان کے شاعروں پر ایسا مقرر اور جامع مقالہ لکھو جسے
پاکستانی شعراء سے متعلق زیرِ تالیف انسائیکلو پیڈیا میں شامل کیا جاسکے۔ پہلے تو ماننے کی غرض سے چند اہل زبان بلوچ حضرات کا
تہہ جنگل اکاڈمی کو بھیج دیا۔ اولہ اس اہم ذمہ داری کے لئے اُن سے رجوع کرنے کی حرکت کی۔ لیکن کئی ماہ کے سکرت کے بعد
جب دوبارہ اصرار شروع ہوا تو میں نے مندرجہ ذیل شعراء پر مقالات لکھنے کی تجویز بھیج دی۔

ہے تقاضا کہ ناخن پر قرض اس گروہِ نیم بان کا (غالب)

۱۔ جام دُرک

۲۔ گل خال نصیر

تجزیہ فردا منظور کر لی گئی اور میں بکھرے ہوئے اوراقِ پارینہ اور خیالِ نحتِ نحت کو مرتب و مدون کرنے لگا۔ چند ماہ کی جانفشانی اور استغراق کے بعد ایک مطول مقالہ انگریزی زبان میں موزوں ہو گیا۔ خیال تھا کہ بنگال اکادمی کو یہ کفایت کرے گا لیکن جب ٹائپ ہو کر سامنے آیا تو تشفی نہ ہوئی۔ برادرِ سعد اللہ خاں بلوچ (انگریزی زبان کے بلند پایہ استاد پرداز اور خوش نوا شاعر) نے مسودہ دیکھا بہت افزائی کی لیکن دل کو اطمینان نہ ہوا۔ مہینوں گزر گئے۔ پھر یکا کی تحریک ہوئی۔ میں نے خود کو ظاہر کرنا چاہا، اور یہ اوراق جمع ہو گئے۔

جام دُرک کے متعلق جو کچھ سنا اور پڑھا ہے۔ اُس کی شاعری اور پیام کو جس قدر سمجھا اور جذب کیا ہے۔ بلوچی زبان و تہذیب کی جس قدر معرفت حاصل کی ہے اور بلوچوں کے مستقل کے متعلق جو کچھ سنا چاہے وہ ان اوراق میں کہیں واضح اور کہیں بہم بین السطور میں نظر آئیں گے۔ لیکن میں نے کسی خاص زاویہ نگاہ سے جام کو دیکھا یا پڑھا نہیں ہے، بلکہ اسے پورے بلوچی شعری ادب کے پس منظر اور تناسبِ باطنی میں رکھ کر دیکھا ہے!

بہر کیف یہ دعویٰ نہیں کہ میں جام دُرک کی روح بہرِ نکل پاسکا ہوں اور اس کے جواہر پاروں کی ٹھیک ٹھیک تعریف کر سکا ہوں شعر کی تفسیر و تعبیر کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنی سچائی کا اعتراف ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ میں اردو زبانِ طبع کے سامنے بلوچوں کی روح کی چند جھلکیاں لے کر آیا ہوں۔ ایسی جھلکیاں جن کی پرچائیاں بھی نور العین میں! میں بنگال اکادمی کا ممنون ہوں کہ اُس نے جام دُرک پر لکھنے کی تحریک کی اور مجھے ندامت ہے کہ مقالہ نہ بھیج سکا۔ ملک محمد پناہ میر تقی محمد خاں، اندیس کے بلوچ سعد اللہ خاں بلوچ، کا احسان مند ہوں کہ ان حضرات نے اپنے قیمتی مشورہ سے نوازا، اور بعض ہلاکتِ آخرین مرحلوں پر رہنمائی فرمائی۔

میں جانتا ہوں کہ بلوچی زبان و ادب کا ارتقا جس رفتار سے ہو رہا ہے، اور قدیم جواہر پاروں کی دریافت جس تندہی سے جاری ہے وہ ایک دن از سر نو شعرا کے مقامات و مدارج مقرر کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دل کہتا ہے کہ جب ہم گشتہ گشتہ ہائے گراں مایہ بازیاب ہو جائیں گے تو بھی جام دُرک کا مقام آج کی طرح بلند ہی رہے گا۔ نئے نئے موضوعات پر نئے نئے زاویے سے گفتگو ہوگی۔ یہ رسالہ حرفِ آخر نہیں۔ افہام و تفہیم کی راہ کھلی ہے۔ تحقیق و تدقیق کا میدان کشادہ ہے۔ لیکن راہِ پر خاں اور سنگلاخ ہے۔ اسے طے کرنا ہر کہ و مہر کے بس کی بات نہیں ہے

حافظ و طیفہ تو دعا گفتن است و بس

در بندِ ای سبائش کہ شنید یا نشنید

انتساب

قوم کے اُن درد انوں کے نام یہ تاجنیز تصنیف معنون کی جاتی ہے، جن
کی ذہنی تربیت میں جوانی دیے پاؤں گزر گئی اور جن کے ظہور کی بشارت
جام دُرک نے دی ہے!

ہنچیں بلوچ درد انغیں

دورِ زماں و پہناں

لیغا نے دھنریں بیت

چھو مہر و الماس و مثال

زنگیں شبہ نبیاں نبیت

زاناں کہ درنا سنگریں

روشنے شہ لوغاں درد گفت

بندت رندی پٹو اں

شرطاں گول ہسی چوٹواں

سو بھد چھو مسک و غبریں

کھٹنتہ در شاہیں وطن!

گوش داریت حدیثاں یاراں
جام و گوشه شمعین گفتاراں

پہلا باب

عہد

ملک الشعراء جام بن درک بن کرم خاں کا مرتبہ بلوچی شاعری میں بہت بلند ہے۔ ایک طرف اس کے سرمدی نغمے کی لئے سولہویں صدی کے دو باکمال شاعری برگ اور شہرید کے نوائے شوق سے ہم آہنگ ہے تو دوسری طرف اس کے قلب تپان کے شرادے ست تو کی کے بیوں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ عشق کا فیضان خود آگئی ہے۔ اور یہی آگہی پیر میں آئیں بن جاتی ہے۔ حیات و کائنات کی تمام پوچھوںی کامرکز و منبع ایک وجود حسن و خوبی سے عبارت ہو جاتا ہے۔ اور کیفیت سرخوشی و خود پسندی کا ایک ایسا عالم رونما ہوتا ہے کہ عاشق اپنی ذات و صفات اُمیہ محبوب میں دیکھتا ہے۔ جذب و انضمام عشق کا سرمدی عنصر اور ناگزیر خاصہ ہے لہذا مجاز و حقیقت کی تقسیم ممکن نہیں۔ خواہ کوئی گوشت پوست کی دو شیر و حسن و جمال سے رغبت کرے یا تصور مطلق کا شہدانی بنے۔ اگر اس کے وجود میں شعلہ عشق کی تپش پیدا ہوتی ہے تو اسے خاکہ ان آب گل سے اوپر اٹھالے گی۔ آگ کی فطرت بلند ہونا ہے، پھیلنا ہے۔ وہ بلند ہوگی، پھیلے گی خواہ اس کے ابتدائی محرکات کچھ ہوں۔ اس شعلے کو کسی لالہ رخ کی آنچ لگی ہو یا تصور مطلق نے اپنی جانب کھینچا ہو۔ یہ ایغور کی عجیب کرشمہ سازی اور طلسم بافی ہے، کہ جب عاشق خود کو محبوب کے حوالے کر دیتا ہے تو پھر محبوب اسے امتحان سے گزارتا ہے، مارتا ہے، جلاتا ہے۔ جلاتا ہے۔ مارتا ہے۔ کبھی گلزارِ ابراہیم کا پر فضا باب کھلتا ہے۔ کبھی طویرِ سینا سُرمد بصیرت بنتا ہے۔ کبھی صلیب پر کھینچتا ہے، کبھی مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لیتا ہے۔ کبھی ہم قاتل سے لبریز پیالہ اجل پیش کرتا ہے۔ کبھی طوقِ زندہ ان و دار کی منزل سے ہٹکا دھونے کی سعادت بخشتا ہے تو کبھی رسوا سر با زارِ

تہا پس زنداں کبھی رسوا سر با زار

یہ حکایت و تلخیص، یہ اشارہ و کنایہ، یہ تشبیہ و استعارہ نہیں۔ ایغور کی طلسم فرمایاں ہیں۔ افسانہ و افسوں نہیں، نگاہوں کے سامنے مرتب و مدون حقیقتیں ہیں۔ جن سے دامن نہیں بچایا جاسکتا۔ اور نہ ایغور کے طرزِ عمل پر منطقی انداز میں تبصرہ کرنا ممکن ہے۔ آنکھیں جو کچھ کہتی ہیں لب پر آنا محال ہے اور دل جو کچھ محسوس کرتا ہے اُسے صفحہ قرطاس پر بکھیرنا مشکل! عشق مجازی ہر حقیقی، کسی تصور مطلق سے ہو یا گوشت پوست کے کسی پیکرِ محبوبی سے۔ نگاہوں سے گزر کر یہ خوشنما

شوخ کا ثنادر میں اتر جاتا ہے۔ طرب بھر اہوڑ لاتا ہے۔ جامِ دُرک کی شاعری اسی دل پر خون کی داستان ہے جس کی سُرخ عالم
عالم پھیل ہوئی ہے، جس کی جوت سے ذرہ ذرہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔

دہر جزوہ بیکت کی معشوق نہیں : ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں
حسن کی خود بینی نے جام کے مزاج کی تفکیر کی شاعری میں بیکت کی تمجیلاں نظر آنے لگیں۔ یہ
اٹھارویں صدی تھی۔ زندگی کی قدریں مختلف تھیں۔ طالعِ آنانی کا زمانہ تھا۔ شمشیر و بنال کی یادِ شہادت تھی۔ ہدیوں کی سیر
گردش کے بعد بلوچوں نے ایک ریاست بنالی تھی۔ اور جامِ دُرک نے جب آنکھیں کھولیں تو یہ عہدِ زریں تھا۔ فضا میں میر عبد اللہ
خاں قاتر کی آواز اور تعاش پیدا کر رہی تھی۔

ترجمہ : کوہنگ ایک مقام کا یہ سرِ لعلِ قلعہ
کسی کے باپ کی ملکیت نہیں
زورِ شمشیر مہم نے اس پر قبضہ کیا ہے !

کوہنگ و اسے کوہیں قلات
کستی پت میراثِ نہ انت
باپ سگاراں کپت گن

یہ پُر فکوحہ آواز قومی جاہ و جلال کی آئینہ دار ہے۔ تاریخ کے اوراق پریشاں سمیٹے جا میں تو میر عبد اللہ خاں والی قلات کا
عہدِ فتوحات و کامرانی کی ایک دل نشیں تصویر بناتا ہے۔ اور پھر ان کے قابلِ یاشیں میر نصیر خاں لودی ان تمام ادھرے
کاموں کی تکمیل کتے نظر آتے ہیں۔ جن کا آغاز موصوف نے کر دیا تھا۔ مثلاً حصولِ علاقہ کچھی۔

میر نصیر خاں لودی کا عہد ”زریں“ کہلاتا ہے۔ طویل رزم و پیکار کے بعد ایک پنج پر زندگی اگنی تھی۔ ریاستِ قلات
کی سرحدیں چاروں سمت اس قدر پھیل گئی تھیں کہ نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد ریاست کا رقبہ اتنا بڑھا۔ نہ مالِ دولت
کی ایسی دہل پیل ہوئی، نہ خوشحالی کی فراوانی کبھی دیکھنے میں آئی۔ تاریخِ بلوچستان میں اس قدر شاندار باب کا افتتاح نہ ہوا تھا اور
نہ اس قدر جانی اندازِ حیات کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بلوچوں کے اس عروج کے دور میں دل گرفتہ
جامِ دُرک کی آواز مختلف نظر آتی ہے۔ اُس کی نوا کے شوق میں وہ رجائیت نہیں جس سے یہ عہدِ آفریں عبارت ہے۔ اُس
کی عشقیہ نظموں کے سوز و گداز کی تعبیر و تفسیر تو ممکن ہے لیکن اس کی قومی شاعری میں جو حزن دیا س پایا جاتا ہے، اس کی
توضیح و تشریح کیوں کر ہو؟ وہ کہتا ہے :-

ترجمہ : ”اگر پتھر کٹوں میں گر جائے
قرن ہا قرن وہیں پڑا رہے
توپانی کا ہواؤ اسے پس نہیں لگتا۔“

ہنگے اگر چات و کفیت
قرن و دراجے مدتے
آف و مشیلاں میرت نیت

یہ مثال نہایت معنی خیز ہے۔ یہاں جامِ دُرک حکیمِ امت نظر آتا ہے۔ وہ بلوچ قوم کی نمایاں خصوصیت اور کردار کو نہایت
دل نشیں استعارے میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

”و حق بحر ان اور مہنگای نہریت سے شکستہ دل نہ ہونا چاہئے۔ کہ اصل جو سر فنا نہیں ہوتا۔ بلوچ قوم کی مانند میں،“

اور مانی کا بھاد اس جوہر کی آب و تاب کو ماند نہیں کر سکتا۔ شوخی قسمت سے اگر وہ ابتلا سے قومی میں مبتلا ہو گئے ہیں، تو ایک دن اس سے نجات پائیں گے۔ وہ پھر اُسریں گے، اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پالیں گے!

بالفاظ دیگر جس حال میں جامِ دُرک سانس لے رہا ہے وہ قابلِ فخر نہیں بلکہ قومی ابتلا رکھتا ہے۔ اور وہ قوم کا اخلاقی قوام خصوصاً انضباط اور اعتماد نفس قائم رکھنے کے لئے اُنہیں زرینِ مستقبل کا پیغام دے رہا ہے۔ رشتہ کی ذہنی تشکیل کا تجزیہ و تحلیل کیا جائے تو مذکورہ اشعار میں خزنِ دماغ کا گہرا ارتعاش پایا جائے گا۔ جو مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے

ترجمہ:- "موتی کی مانند بلوچ

زمانے کے نشیب و فراز

دادیں گرد و غبار سے اکودہ نہیں ہوتا

بلوچ ایسے سونے اور الماس کی مانند ہے

جسے نمی سے ہرگز رنگ نہیں لگتا"

ہنچتیں بلوچ دُرکِ داغیں

دورِ زماناں میں نہاں

لیغاروں نے دھینڑیں بیت

چھوٹے دماغ میں مثال

زنگیں شہِ نبیاں بیت

بلوچوں کی قومی خصوصیت بیان کرنے کے بعد وہ بشارت دیتا ہے کہ وہ زمانہ آئے گا جب پُرانی روایات تازہ ہو جائیں گی اور بلوچ تہذیب کو عروج ہو گا۔

ترجمہ:- "میں جانتا ہوں کہ اولوالعزم نوجوان

ایک دن اپنے گھروں سے نکلیں گے

دندوں کے انداز میں اپنے پیروں کو باندھ لیں گے

اپنے سر کی باندھی لگائیں گے

اور شاندار فتح حاصل کریں گے

وطن کے وقار کو بڑھائیں گے"

زماناں کہ و زمانہ سگریں

روشے شہِ نوناں در کفنت

بندتِ زندگی پڑاں

سرطاں گوں بسی چوٹاں

سویچہ چھوٹے مسک و عنبریں

کھشتِ دشنامیں وطن

یہ اشعار آئینہ دار ہیں کہ روشن مستقبل کی دلکش تصویر دکھانے والا یہ نقاش ہنرمندہ حال سے غیر مطمئن ہے۔ رومانی رجائیت تحت اشعار کی غمگینی اور اضطراب و اضطراب کو چھپانے سے قاصر رہتا ہے اور یہ اشعار بلا شک و شبہ عہدِ زریں کے بچائے قومی ابتلا کے دور کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔ محبِ گرامی فیض احمد فیض جب کہتے ہیں سے چند روز اور میری جان نقطہ چید ہی رہد : ظلم سہنا ہے مگر یوں تو نہیں سہنا ہے!

تو ان کا انداز بیان جامِ دُرک سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں شعراء روشن مستقبل کی حسین و خوش نما تصویریں

۱۔ یعنی میدانِ جنگ میں متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے (دک)

دکھاتے ہیں۔ حال سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دھارس بندھاتے ہیں کہ یہ جبر و استبداد اور محکوم پر
پیمانہ لگی، یہ ذہنی افلاس اور روحانی ابتوری کے دن تھوڑے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طبیعت کی یہ افسردگی محض عشق ستم پیشہ کی پیدا کردہ تھی یا اس کا تعلق اس عہدِ ذرین سے
بھی ہے جس کی آغوش میں جامِ دُرک نے آنکھیں کھولی تھیں؟

جامِ دُرک کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں۔ اور اب کوئی ایسا مستند ماخذ بھی موجود نہیں جس کے کوئی بھی
فیصلہ کیا جاسکے۔ آج سے سو برس پہلے ڈیزنے جامِ دُرک کے متعلق جو دریافت کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

”ڈیزنے کی قیاسی کا ایک شاعر تھا جس کا تعلق نصیر خاں اول کے دربار سے تھا“

نصیر خاں نوری کی وفات ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۷۷۷ء میں ہوئی تھی۔ اور متعدد درذایات کے پیش نظر یقینی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ
وہ نصیر خاں نوری کے عہد ہی میں وفات پا گیا۔ یا ایک روایت کے مطابق قتل ہوا۔ بہر کیف عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ
جامِ دُرک اٹھارہویں صدی کا شاعر تھا اور اس کا تعلق دربارِ قلات سے تھا۔ البتہ یہ سوال جواب طلب رہتا ہے کہ جامِ دُرک
اس عہدِ آخرین سے اس قدر مایوسی اور بیزاری کا اظہار کیوں کرتا ہے۔ اور اس عہد کی تعریف میں رطب اللسان ہونے کے
بجائے اسے بلوچوں کے لئے آزمائش و ابتلا کا دُرک کیوں بتاتا ہے۔ اس رجحان کی مختلف انداز میں تعبیر کی جاسکتی ہے۔ اول
یہ کہ دُرگفتار شاعر میر عبد اللہ خاں کے زمانے میں عالمِ وجود سے متصف شہود پر اچکا ہو گا۔ اور اس کی شاعری بھی عقوانِ شباب
پر پہنچ چکی ہوگی۔ مذکورہ اشعار ممکن ہے کہ میر عبد اللہ خاں کی شہادت اور کلہوڑوں سے ہزیمت کے فوری بعد کے ہوں یا
پھر ان کے جانشین میر محبت خاں کے زمانے کے ہوں گے۔ کیونکہ میر عبد اللہ خاں کی شہادت کے بعد ایک ہنگامی صورت
حال پیدا ہو گئی تھی۔ اور میر نصیر خاں نوری کی مندرجہ ذیل مضطرب و اضطراب کے سیاہ بادل اُفتِ قلات پر منڈلاتے رہے
تھے۔ لہذا قومی موڑ کی (Mourning) کو برقرار رکھنے اور بند نگاہی، غم و حوالت، اطمینان و حوصلہ مندی کے ساتھ صورتِ حال
کا مقابلہ کرنے کے لئے روحانی رجائیت اختیار کی گئی اور روشن مستقبل کا نقشہ کھینچ کر جامِ دُرک نے حال کی تلخی اور سختی کو
بے حقیقت بنا دیا اور خشک خاطر قوم میں زندگی کی جولانی پیدا کر دی۔

اس قیاس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جامِ دُرک ۱۷۷۷ء تا ۱۷۸۵ء کے درمیان پیدا ہوا ہو گا۔ اور اس کی وفات
نصیر خاں نوری کی زندگی میں ہوئی ہوگی۔ تمام واقعات اور حالات کی چھان بین کا ماحصل یہر صورت یہی ہے کہ جامِ دُرک
اٹھارہویں صدی کا شاعر ہے۔ اس کی تائید گ خاں نصیر عبد اللہ جان جالندیزی، آزاد جالندیزی، سلیم خاں گبی اور امیر عثمان بھی کرتے
ہیں۔ البتہ بشیر احمد صاحب بلوچ کو اس سے اختلاف ہے۔

سہ راوی میر گئی حسن صاحب ڈیزنے کی نیز فیض بخشا پوری صاحب ڈیزنے کی اس روایت کی تصدیق دوسرے ماخذ سے نہیں ہوتی۔ ڈیزنے
نے صریحاً جامِ دُرک کے اسبابِ موت کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا۔

جامِ دُرک کون تھا؟ زبانِ دانی کا ایک تنازعہ! ہمارے ادب کے نئے آسمان پر کب چمکا؟ اور کب غروب ہوا؟ ان باتوں کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جامِ دُرک کی بابت جناب لاٹک درتھ ڈیمز بلوچوں کی عام پسند شاعری میں صرف اتنا لکھتے ہیں کہ وہ خان نصیر خاں فودی کا درباری شاعر تھا۔ اس کی پیدائش کا دن اور نہ سن وہ جانتا ہے اور نہ اس کے مرنے کی جگہ۔۔۔۔۔ جام اگر نصیر خاں کا درباری شاعر ہوتا تو اُس رٹنے کو کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا۔ زندہ قومیں ایسے نامور دل پسند، در بیان، شاعروں کی یاد دہناروں سالوں کے بعد بھی "دیوان" اور محبوسوں میں تازہ رکھتی ہیں۔ ہر سال اُس کے پیدا ہونے کی خوشی یا اُس کی وفات کا ماتم کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جامِ دُرک بیروالی (گکھ بان)، قسم کا شاعر تھا۔ (رسالہ اریس دیوچی، کوئٹہ۔ شمارہ نمبر دسمبر ۱۹۶۲ء)

شیر احمد صاحب نے ایک سانس میں مبہم طور پر تین مسائل چھیڑے ہیں۔ اول جامِ دُرک کا عہد اشعار صوبہ صدی نہیں۔ دوم وہ نصیر خاں فودی کا درباری شاعر نہیں۔ سوم، وہ "پہوالیں بلوچانی" شاعر ہے یعنی اُن پڑھ، گکھ بان اور آجڈ شاعر ہے لیکن انہوں نے اپنے اس نقطہ نظر کے لئے جو دلائل دیا ہیں مذکورہ بالا اقتباس میں پیش کئے ہیں وہ درشتہ سخن کی عقید کشائی کے لئے کافی ہیں۔ اور ان میں منطقی ربط نہیں پایا جاتا۔ اس قسم کی بے سرو پا عبارت اور بغیر دلیل دعوے زیر بحث موضوع کی گروہ کشائی نہیں کرتا اور نہ عہد کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ان کے برعکس سلیم خاں گکھی بغیر چون و چرا اشعار صوبہ صدی کا شاعر مانتے ہیں۔

جامِ دُرک اشعار صوبہ صدی کا بلوچی شاعر ہے۔ وہ ظلات کے بردہ فرماں ردا نصیر خاں فودی کا درباری شاعر تھا اور خان نے اُسے شاعرِ اعظم کا خطاب دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جامِ دُرک شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک عوامی شاعر ہے۔ اُس کا ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں قصیدہ خوانی کا پہلو نکلتا ہو۔۔۔۔۔

جامِ دُرک کی صحیح تاریخ وفات تحقیق کے باوجود معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ بلوچوں کے ڈومکی قبیلے کا فرد تھا اور اس کے باپ کا نام کر مو تھا۔

غرض کہ عہد کی تعین میں سلیم خاں گکھی باوجود تحقیق کوئی نئی دریافت نہیں کر سکے اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ اُن سے بہت پہلے ڈیمز لکھ چکا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم نہیں کہ تحقیق و دریافت کی معرکہ آرائی اور ہم جوتی میں انہوں نے وادی صحران کی کتنی خاک چھانی اور بعد جامِ دُرک کے کلام کو کس قدر جذب کر کے لے لے

یہ عجیب بات ہے کہ جامِ دُرک اس قدر قریبی دور کا شاعر ہے۔ لیکن اس کا بیشتر کلام دستِ در زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور ڈیمز کی قلمبند کی چھٹی پانچ نظموں اور چند مہرے ہوئے دردانوں کے ماسوا کچھ نہیں ملتا کہ عہد کے تعین کی دشوار گزار

یہ قیاس درست نہیں کہ مویا کریم خاں جام بن درک کا دادا یا جد میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل بلوچی متن گکھی صاحب کے پیش نظر نہیں تھا۔ انہوں نے انگریزی ترجمہ دائر ڈیمز سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ اس لئے تیرنٹن نے یہ نہیں بیٹھا۔ بلکہ سلیم گکھی صاحب کا آخذ ڈیمز اور وہ اردو

مثلاً پہلے ہونے کے باوجود متعدد اول کلام کی زبان اور پیرایہ بیان غمازی کہ وہ اٹھارہویں صدی کا شاعر تھا۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے بلوچی زبان کے شعراء کے ڈکشن (شعری فرہنگ) پر تحقیقی نظر ڈالی جائے اور شاعری کی فصاحت و بھیر کا تجزیہ کیا جائے تو جام درک ان سے مختلف نظر نہیں آتا۔ بان زور بیان اور اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا کلام بڑھ جاتا ہے۔ اور اسی بناء پر اسے ملک الشعراء کہا گیا ہے۔ داخلی شہادت کی بنا پر یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ جام درک میر عبد اللہ خان کے عہد میں پیدا ہوا۔ بلا، بڑھا، میر محبت خان کا زمانہ دیکھا اور میر نصیر خاں نوری کے عہد حکومت میں فوت ہوا۔ نیز اس کی قومی شاعری آئینہ دار ہے کہ وہ اپنے عہد سے مطمئن نہیں تھا۔ اس بے اطمینانی کی وجہ میرے خیال میں محض عشقِ ناکام کی پیدا کردہ نظر نہیں آتی بلکہ اس کے دل دردمند، فزول تریجد، قومیت اور رنگ، بصیرت افزا پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ ملک گیری سے کہیں اہم کام نظم و نسق کی درستی ہے اور ایک بلوچ کے لئے رجب بالا تر شے بلوچیت ہے۔ وہ نصیر خاں نوری کے غنائم اور سیاسی و معاشرتی اصلاحات کو دیکھتا ہے تو اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے اس پر کڑھتا ہے اور ماضی کے آزادانہ بلوچ معاشرے کی تخیلوں میں کھو جاتا ہے۔

زاناں کہ ورناسنگریں

روشنے نہ لوغاں در کفنت

بندت زندگی پلوں ال

شرطال گوں ہمیں چوٹواں

سیر سہرہ چھو مسک و حیریں

کھشتو دشنامیں وطن!

یہ تنہا جام درک کے جذبہ قومی کے لہن سے پیدا ہوئی اور اس رجحان کی تشکیل میں عہدِ نرین کے محرکات کے ساتھ ساتھ ہونے لگا ہے۔ کہ اس کی آشفتمندی اور صحرانوردی کو بھی دخل ہو۔ عشق میں ناکامی نے اسے قبل از وقت بڑھا کر دیا ہو۔ اور زندگی اور اس کی بدلتی ہوئی قدروں سے وہ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکا ہو۔ یہ کیف میر نصیر خاں نوری کے عہد میں اس کا پایا جانا یقینی ہے۔ نیز تمام معروف روایتوں اور مآخذات پر نظر انصاف ڈالی جائے تو دو گروہ دانی محال ہے۔ حیرت ہے کہ بشیر احمد صاحب بغیر کسی معقول وجہ اور محکم استدلال پیش کرنے کے جام درک کو اٹھارہویں صدی سے بھی قدیم شاعر ماننے پر اصرار فرماتے ہیں۔ بزرگ گرامی میر گلی حسن خاں صاحب ڈومکی سے روایت ہے :-

”جام درک نصیر خاں نوری کے عہد کا شاعر ہے۔ وہ اپنے دل نشیں نغمات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کا بیشتر کلام

براسی رسول بخش سکھ راجن پور کو یاد ہے۔“

میر تقی میر خفا کا بیان ہے۔

وہ یوں کو میر نصیر خاں نوری کے عہد میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ کامیابی نہ صرف میر نصیر خاں کے حسن اخلاق، خوبی سیاست، جرأت حرب و ضرب اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کی وجہ سے ہوئی بلکہ جام بن ڈرک بن کم خاں کی سیما نفسی نے بھی یوں کو گہری نیند سے بیدار کیا۔ اور قوت قوی کے اعلیٰ وارفع جذبے کا شعور بخشنا۔

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ جام ڈرک کی قوی ثنوی کی تعبیر و تفسیر کسی انداز میں بھی کی جائے اور اس کے متبادل کلام کو کسی روشنی میں بھی دیکھا جائے۔ یہ بات داخلی شہادت کی بنا پر بغیر خوف تردد کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اٹھارہویں صدی کا شاعر تھا۔ داخلی شہادت، تاریخی استخراج میں دستاویزی شہادت اور خارجی علامات کی غیر موجودگی میں فیصلہ کن اور حتمی سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا باب

افسانہ و افسول

جام دُرک کی سوانح حیات اکثر بیشتر پروج مشاہیر و ممتاز شخصیتوں کی طرح کتاب گم شدہ ہے۔ تمام ماخذات اور روایات کو یکجا کرنے کے بعد اُن پر نگاہ شوق ڈالی جائے تو مندرجہ ذیل معلومات ملتی ہیں۔

۱۔ نام جام بن دُرک بن کرم خاں دُرکسکی تھا۔

۲۔ دربار قلات سے اُس کی راہ درسم تھی۔

۳۔ وہ متبلائے عشق تھا۔

ظاہر ہے اس قدر مختصر معلومات کی روشنی میں شاعر کی شخصیت اور حالات زندگی کے نمونے بنانے کو کس طرح بنا جا سکتا ہے ہاں ایسے سوالات کا طومار لگ جاتا ہے جس کا ثانی جواب موجود نہیں اور قیاس کے لئے بھی مناسب ہیج نہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ دُرکسکی قبیلے کا اگر فرد تھا تو اس کی حیثیت اپنے قبیلے میں کیا تھی؟ آیا وہ امیر تھا، صاحب جاہ و ادا تھا، قبائلی معاشرے میں کسی قطار و شمار میں آتا تھا یا نہیں۔ ان سوالات کا ہمیں جواب نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں راقم السطور نے لہری اور حبیب آباد کے عمر رسیدہ دُرکسکیوں سے تبادلہ خیال کیا۔ نیز مختلف گوہر گوشتوں سے بھی استفادہ کیا۔ لیکن کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اور نہ شجرہ نسب کا ہی پتہ چلا۔ البتہ ہر جگہ اور ہر دُرکسکی میں یہ قابل قدر جذبہ دیکھا کہ وہ جام دُرک کو اپنے خاندان کا چشم و چراغ ظاہر کرتے ہوئے گزشتہ سال ہجرت میں نے لہری، سٹی اور حبیب آباد کا دورہ کیا اور جام دُرک کے متعلق دریافت کرتا رہا۔ کئی نئے اشعار سنئے اور بیاض میں نقل کر لئے۔ لیکن حالات زندگی کے متعلق میری معلومات میں اضافہ نہ ہوا۔ دورانِ قیام حبیب آباد میں برادرِ مخلص بھٹنا پوری سے رجوع کیا تو انہوں نے فخریہ انداز میں فرمایا۔

”دُرکسکی قبیلے میں مشاہیر کی کمی نہیں۔ ادبی دنیا میں بھی ہر نسل میں ایک بڑا شاعر پیدا ہوتا رہا ہے۔ جام دُرک سے محض ایک ایک سلسلہ قائم ہے۔ جام دُرک شاعر اعظم تھا۔ شعرِ جام، باقی ناکام“
منش مشہور ہے۔ نصیر خاں ٹوری اُس سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جام دُرک دُرکسکیوں میں ولی اللہ مشہور ہے۔“

یوچوں میں "ولی" کا لقب ہر بزرگ مہتمی اور نامور شخص کے نام سے جذب کرنے کا عام رجحان ہے۔ میر چاکر خاں رند کے لئے بھی "ولی" کا لقب آتا ہے۔ اور ان کی ولایت کے کئی قفے مشہور ہیں۔ ایک روایت ہے کہ کوہ سلیمان کی ایک چوٹی پر ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کا نشان اور نعل پایا جاتا ہے۔ اور اس کی زیارت سے حاجت روائی ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔ ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جام دُرک واقعی صاحب ولایت بزرگ تھے۔ یا محض ان کی شاعرانہ عظمت کو دیکھ کر لوگوں نے انہیں یہ لقب دے دیا ہے۔ البتہ اگر یہ تحقیق ہو سکے کہ وہ صاحب ولایت بزرگ تھا تو اس کے بعد یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے راہ سلوک کی منزل پس طے کرنے کے لئے کسی بزرگ کے آستانے پر جیں مائی ضرور کی ہوگی۔ صاحب بیعت ہوگا۔ کیونکہ بغیر بیعت یہ کسٹن منزل پہن نہیں ہوتی۔ پھر ریاضت و مجاہدہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن ان نتائج کا استخراج اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب صاحب ولایت بزرگ ہونا ثابت ہو جائے۔

پھر کیف یوچوں میں جام دُرک ولی مانا جاتا ہے۔ اور راقم السطور اس ولایت کو محض جام بن دُرک کی شاعرانہ عظمت کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ بصیرت افروز نگاہ رکھتا تھا۔ اور عشق نے اُس کے قلب کو اس قدر جلا بخشی تھی کہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز اُس پر آشکار ہو گئے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عشق کی ناکامی اور جبر و قوت نے "یا دہائی" کا جذبہ پیدا کر دیا ہو اور وہ مجاز سے حقیقت کی جانب رجوع ہو گیا ہو۔

صاحبانِ دل بخوبی جانتے ہیں کہ عشق جب مجازی منزل سے دامن کشاں گزر جاتا ہے تو پھر وہ روحانی فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ شہرید اور دست توکل کی شاعری پر نگاہ باز گشت ڈالئے۔ وہاں عشق کے ابتدائی محرکات مجازی لباس میں رونما ہوتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر عشق و محبت تجریدی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں۔ مادی بکجہ محبوب تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور محض جلوہ حسنِ کیا کی خبر لاتا ہے۔ جام دُرک کی شاعری میں یہ پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ غور الی المقصود تمام روایات اور آقاؤذاتِ نیز شخصی دریافت سے یہ تقدیر ہوتی ہے کہ جام دُرک قبیلہ ڈوہکی سے تھا۔ البتہ یہ دعویٰ فرید ثوابہ کا محتاج ہے کہ وہ میرزئی

(متعلقہ صفحہ ۱۸) فیض بخشا پوری صاحب کا یہ بھی دعوئے ہے کہ جام دُرک میرزئی ڈوہکی تھا۔ اور اُس کے گھرانے کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام فیض صاحب نے مٹھا خاں میرزئی بتایا ہے۔ واضح رہے کہ میرزئی شاخ ڈوہکی سے ہی سزاوار ہوتے ہیں۔ یعنی جام دُرک سرداری قبیلے کا ہے اور پھول نہیں۔ جلیا شیر احمد صاحب نے لکھا ہے۔ اس روایت کی تصدیق بزرگ محترم بیگ حسن خاں صاحب ڈوہکی سے بھی ہوتی ہے۔ راقم السطور مٹھا خاں میرزئی سے رابطہ پیدا نہیں کر سکا۔ (دک) شے میر نصیر خاں نوری خاں مظلم کی جامع سوانح موجود ہے اور یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ صاحب ولایت بزرگ نہ تھے۔ مگر یہی اُنہیں مخاطب کرتا ہے۔

دختر نصیر خان ولی | المذللے نصیر خان ولی !
ہئی نیاں اُن ترہ کے | گھر رادر بیان میں سے بدک گیا ہے
سر دیگے | ہماری بار ہو گئی دآج نام ہو گئی ہے
باری باری آئے گی !

دُر کی تھار نیز داخلی شہادت یعنی اس کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبانوں پر کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ ہذا
بشیر احمد صاحب کا یہ شوشہ کہ وہ پہوال شاعر ہے نہ صرف عمل نظر ہے، بلکہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد کے مصداق ہے۔ کیونکہ
جام درک کے اشعار کی سطح بہت رنگین ہے اور اُس کے دُکھ میں گوہر معنی کی روشنی ہر منور کی آب و تاب اور چمک دمک کو
آئینہ دکھاتی نظر آتی ہے۔ نیز اس کے معنی آفریں کلام میں جس تہذیب تمدن کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ نگہ بانوں کی نہیں، بلکہ
تہذیب ترین دربار قلات کی ہے۔ اُس نے جن زہرہ جبینوں اور لالہ زخوں اور زہرہ شکن حسینوں کا سراپا کھینچا ہے وہ سادہ،
اور معصوم، نگہ بان لڑکیاں یا اہل ہندو شہزائیاں نہیں، بلکہ وہ تہذیب یافتہ و شائستہ شہری لڑکیاں ہیں۔ جو دھادر کے بازار میں
شونگ (سودا سلف) کرتی ہیں۔ نیز وہ طبقہ امراء کے رہن سہن، تہذیب تمدن اور طور و طریق سے بخوبی واقف تھا۔ جس سے
واضح طور پر بغیر خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ خود طبقہ امراء سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ لیکن اُس نے اپنی شاعری میں طبقہ امراء
کی زندگی، طور طریقہ، رہن سہن، لباس اور زیورات کو پیش کیا ہے۔ جس سے کسی پہوال شاعر کو مناسبت نہیں ہو سکتی۔ اُس
کے کلام میں تشبیہ و استعارے کے سد اپہار پھول اس امر کی گواہی کرتے ہیں کہ یہ گل خود در نہیں، بلکہ صرفہ خون جگر سے ان
کی آبیاری کی گئی ہے۔ نیز غزل نگار شاعری سے یہ بھی حکشف ہوتا ہے۔ کہ اُس نے متداول تعلیم حاصل کی ہوگی۔ اور فارسی و عربی
سے بخوبی واقف تھا۔ قرن، مدت، دراز، الماس اور سنگوں کی ایسے عربی و فارسی زبان کے الفاظ اس کے کلام میں موجود
ہیں جو اُس دور کے پہوال یا دُوم شعراء کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ لہذا بشیر احمد صاحب کا یہ دعویٰ قطعاً درست نہیں
کہ وہ پہوال شاعر تھا۔ پہوال شاعر کی زبان اور امیجری (تشبیہیں اور تشبیہات و استعارے) اور پڑھے لکھے شاعر کی زبان اور
امیجری میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ جام دُک کے کلام کو سامنے رکھا جائے تو یہ تہذیب ترین دماغ کی پیداوار نظر آتا ہے۔
جام دُک کے والد بزرگوار کون تھے؟ اس کے متعلق بشیر احمد اور سلیم خاں لکھی کا خیال ہے کہ اُن کے باپ کا نام کر مو تھا
سلیم لکھی کہتے ہیں۔

”اُس کے باپ کا نام کر مو تھا۔ یہ بات کہ اس کے باپ کا نام کر مو تھا اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ
باپ کا نام اکثر وہ اپنے اشعار میں لاتا ہے۔ قدیم بلوچ شاعروں میں رواج تھا کہ وہ نظم یا گیت کہنے سے
پہلے عرب شاعروں کی طرح اپنا حسب نسب اشعار میں بتاتے تھے۔ مثلاً چاکر خاں زند کہتے تھے۔ گور گج
قبیلے کا بہادر بالاج کہتا ہے۔ فراخ دل نو دیندر کہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جام درک بھی اکثر اپنی
نظموں اور گیتوں کی ابتدا یوں کرتا ہے کہ ”جام درک کہتا ہے“ ”جام درک دُک کہتا ہے“۔ اور
جام درک کر مو کہتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے قبیلے کا نام دُک اور بلک نام کر مو تھا۔“

سالہ فیض بخشا پوری صاحب نے ایک ملاقات مقام جیک آباد ۴۴ مئی ۱۹۶۳ء میں کہا: جام دُک کے متعلق یہ کہنا غلط ہے کہ وہ پڑھا لکھا نہ

سلیم گنجی کے ذہنِ نکتہ رس نے استدلال کا نہایت اچھا نمونہ اور قابل قبول پہلو پیدا کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ نتیجہ کا استخراج درست نہیں کیونکہ انہوں نے جامِ دُرک کی ترکیب پر غور نہیں کیا۔ اور اسے ایک نام نرمن کر لیا ہے۔ اصل جامِ بنِ دُرک ہے جیسا کہ جامِ خود کہتا ہے :-

سار زانت جامیں دُرک ۛ ترجمہ :- (جامِ بنِ دُرک ہے) دُرک کے جام کے پاس سے آئی ہوں

کرمو ۛ سولیں پیگ ۛ وہ (جامِ بنِ دُرک) جو کرمو کا بیوت ہے

یہ شعر بہت واضح ہے اور اس سے زیادہ موثق شہادت کیا ہو سکتی ہے۔ ”جامیں دُرک“ اور ”سولیں پیگ“ کی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ جام کے والدِ بزرگوار کا نام دُرک تھا۔ باپ کے نام اہم جزو بیوت کے نام کے ساتھ بیوت کرتے کارواجِ کرم بھی بہت عام ہے۔ نیز ”سولیں پیگ“ باپ کے لئے نہیں آتا نہ صرف دادا، پردادا سے غرض ہے بلکہ جد میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میر گل حسن صاحب دُدمیکی سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی تصدیق فرمائی کہ جامِ بنِ دُرک بنِ کرم خاں قرأت کرنا ہی درست ہے۔ البتہ یہ تشریح طلب اس لیے کہ کرمو ”کرم خاں“ یا کرم بخش وغیرہ میں سے کس کا مخفف ہے۔ یہ دو نام بلوچوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور کرم دین، ”یا کرم الہی“ ناظر نظر آتے ہیں۔

بلوچوں کا نام تجویز کرنے کے سلسلہ میں ہر قوم کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ کوئٹہ اور قلات دُومیرنوں کے بلوچوں کا یہی ایک مخصوص مزاج ہے۔ جس کی تحلیلی کی جائے اور دُومیکی قبیلے کے ناموں کی تہرست بنا کر استخراجی طریقہ اختیار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرم خاں عام پسند نام ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرمو ”کرم خاں“ کا مخفف ہے۔ اس قیاسی نتیجے سے قطع نظر یہ یہ بھی ہے کہ جامِ بنِ دُرک کے دادا یا پردادا کے نام کا پہلا ”گ“ کرم کے علاوہ دُوسرا نہیں۔ میر گل حسن صاحب دُدمیکی سے روایت ہے کہ جامِ بنِ دُرک کے دادا کا نام کرم خاں تھا۔ جو بہت مشہور ہو گزرا ہے۔ اور اسی لئے جام اپنے باپ کے ساتھ اس کا ذکر بھی بڑے فخر سے کرتا ہے۔

جامِ دُرک کے متد اول کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جس سے میر نصیر خاں نوری اور جامِ دُرک کے باہمی رشتے پر روشنی پڑتی ہو۔ اور واضح ہو سکے کہ جامِ دُرک کا دربارِ قلات سے کیا تعلق تھا۔ نیز یہ معلوم ہو سکے کہ ملک الشعراء کا خطاب میر نصیر خاں نوری نے سلا کیا تھا۔ یا محض اس کی شاعرانہ عظمت کے پیشِ نظر وہ ”سرشار“ مشہور ہوا۔

سلیم گنجی صاحب رقمطراز ہیں :-

”خان نے اُسے ”شاعرِ اعظم“ کا خطاب دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جامِ دُرک درباری شاعر

ہوتے ہوئے بھی ایک عوامی شاعر ہے اس کا ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں قصید خوانی کا پہلو نکلتا ہو“

سلیم گنجی نے قوتِ تخیل کی مدد سے جامِ بنِ دُرک کو درباری شاعر بنا دیا۔ نیز یہ بھی بڑا دیا کہ نصیر خاں نوری نے اسے ”شاعرِ اعظم“ کا

تخطاب عطا کیا تھا۔ حالانکہ کوئی قابل اطمینان شہادت موجود نہیں۔ جہاں تک قصیدہ خوانی کا تعلق ہے۔ تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بلوچ اصرار کے دربار میں شعراء قصیدہ خواں نہیں ہو کر تھے بلکہ یہ خدمت لوری، دوم یا میراثی انجام دیا کرتے تھے۔ لہذا کوئی بھی بلوچ شاعر شخص واحد کی تعریف و توصیف سے اپنی زبان آلودہ نہیں کرتا۔ بلوچ شاعر مدح سرائی سے گریزاں اور قوت کی پرستش سے ہمیشہ بے نیاز نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید کسی دور میں بھی قصیدہ گوئی کا وہ انداز پیدا نہ ہو سکا، جو فارسی شعراء کا طرہ امتیاز اور ایرانی دربار داری کا متنازع پہلو تھا۔ لہذا تسلیم کی جاوے کہ اس پر نہ صیرت کے اظہار کی ضرورت ہے اور نہ بشیر احمد صاحب کو یہ ثابت کرنے کے لئے آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی حاجت تھی کہ وہ درباری شاعر نہ تھا۔ میرے خیال میں یہ دونوں حضرات ڈیزر کے اس جملے سے مغالطے میں پڑے ہیں۔

"A. Poet of the Dombki tribe, who
lived at the Court of Naseer Khan I,
..... in the 18th century"

اس جملے سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ جام درک، ملک الشعراء، تھا یا میر نصیر خاں لوری نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ لفظ "LIVED" نہایت مبہم ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ دربار قلات سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے۔ نیز یہ اور بھی توجہ طلب ہے کہ اگر ڈیزر کو اس کی خبر ہوئی کہ دربار قلات سے جام درک کی وابستگی کی نوعیت کیا تھی تو وہ ہرگز ایہم پیدا نہ کرتا اور واضح طور پر ملک الشعراء یعنی Poet Laureate لکھتا۔

میری رائے میں یہ دونوں باتیں درست معلوم نہیں ہوتیں۔ ہاں بغیر شک و شبہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دربار قلات سے جام بن درک کی راہ درسم اور قلعہ میر کی میں آمد و رفت رہتی تھی۔ اس کے ثبوت جا بجا اس کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔ جن سے اغراض کی کوئی صورت نہیں۔ لہذا یہ تسلیم کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں کہ جام بن درک اپنی شاعرانہ عظمت کی وجہ سے ملک الشعراء مشہور ہوا۔ اس مسئلہ پر بشیر احمد صاحب نے مطول بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ جام درک اگر نصیر خاں لوری کا درباری شاعر ہوتا تو یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہتی، بلکہ ہر شخص پر یہ روز روشن کی طرح آشکار ہوتا۔

۲۔ جام کے شعر سے درباری شاعر ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جام دربار کی شاعری کے لئے وہاں نہیں گیا تھا۔ بلکہ وہ اپنے شاعر تھا اور اسے دربار کی شان سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ آج بھی کئی قومی مجلس یا میٹنگ میں بلوچ شعراء شعر پڑھتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ مبادا ان پر لوری کی بھینٹی نہ کس دی جائے۔ اندرون بلوچستان کی ہرزہ گردی کرتے ہوئے متعدد ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ اصرار کے باوجود معزز شعراء اس سے منہ پھرنے لگے۔

۴۔ اٹھارہویں صدی کا ڈومکی قبیلہ کا ایک شاعر جو نصیر خاں لوری کے دربار میں تعلق تھا۔ ۳۱ مارچ ۱۸۶۲ء کو شہید ہوا۔ ۱۸۶۲ء

۳۔ جس طرح بلوچی دفاتر کے اور اشعار مرتب و مدون کئے گئے ہیں۔ جام کے اشعار جمع نہیں کئے گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُس کی گفتار کے کتنے حصے باقی رہ گئے ہیں اور کون سا حصہ گم ہو چکا ہے۔ بہر کیف جتنے اشعار لوگوں کو یاد ہیں ان اشعار میں بھی ایک شعر ایسا نہیں جو دربار یا حاکموں کو خوش کرنے کے لئے کہا گیا ہو۔ نصیر خاں نوری کا نام ہر ایک شان سے لیتا تھا۔ مگر جام دُرک نے اُس کی صفت میں کچھ نہیں کہا۔ نہ اُس کی جگلوں کی تعریف و توصیف کی، نہ دربار کا نقشہ کھینچا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بلوچ شاعر کی طبیعت آزاد سے قصیدہ گو کو مناسبت نہیں بلکہ وہ ننگ و نام کے خلاف ہے۔ ہاں، اُن کا جو ہر قلم دیکھتا ہو تو رزم و ریم پر نگاہ ڈالئے، گھوڑوں کی تعریف میں کہے ہوئے اشعار کوئی پڑھے اور ان صفات کو شمار کرے، جو انہوں نے اس سے متعلق کہا ہے۔ یا پھر نامہ بر کو ترکستان میں قصیدہ سُنے اور وہ انجاد دیکھے جو وہ اُس سے پیام رسانی کے لئے کرتے ہیں۔ یا پھر اپنی قوم کی من حیث المجموع صفت و ستائش کرتے ہیں۔ شہداء کی تعریف کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ بہادر دشمن کی بھی فراخ دلی سے تعریف کرتے ہیں۔ لیکن محض کسی سردار یا سر سردار یا بیگلر بیگی کی تعریف کو عار سمجھتے ہیں۔ اور پھر جام دُرک ایسا شاعر کیونکہ آلودہ حکایت خسرواں ہوتا۔ جبکہ اُس کے ذوقِ مدحت خوانی کی تسکین کے لئے غارِ اشکانی راس آئی تھی اور اس کا پری تمثال محبوب موجود تھا۔ اُسے اپنے محبوب کے چشم و ابرو، عارضِ دلب کی صوت گری سے کب فرصت تھی۔ کہ کسی اور جانب نگاہ کرتا، نیز کیا وہ اپنے محبوب کے سوا کسی دوسرے پر نگاہ غلط انداز ڈالنے کے قابل بھی تھا؟

ان تمام مباحث کی روشنی میں جام دُرک کا تعلق دربارِ قلات سے وابستہ نظر تو آتا ہے لیکن نزاکتِ تعلقات کا پتہ نہیں چلتا۔ جہاں تک ملک الشعراء کے خطاب کا تعلق ہے۔ میری پختہ رائے ہے کہ باضابطہ یہ خطاب دالی قلات نے اُسے عطا نہیں کیا، بلکہ اُس کی شاعرانہ عظمت و کمال کی وجہ سے لوگوں نے اُسے اس نام سے معنون کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے دورِ حاضر میں سرزمینِ وطن کے قابلِ فخر فرزند گل خاں نصیر کی شاعرانہ عظمت کے پیش آہیں "سرشار" لکھتے ہیں۔ اور احباب و عقیدت مند بھی انہیں ملک الشعراء کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

جام دُرک کے عشق کی داستان اُس کے کلام میں بھری پڑی ہے۔ اُس کے دل سیلابِ صفت کی تڑپ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اُس کی صدائے شوق میں دلِ اغشته بہ خون کی سُرخ می ہوئی ہے۔ اُس کے چشمِ خوباں سے پکا ہوا ہوسِ خشن کی مانند کودتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ عاشق تھا اور ظاہر ہے کہ جس پر بھی وہ شاعرِ خوب و بد جام کے معنی جو ان خوب و بد سے عاشق رہا ہو گا وہ یقیناً مجموعہ حسن و خوبی ہو گا۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجیب : ہر عالم گواہ عصمتِ اوست

۱۔ دیکھئے "تو کیں درد" ہفت روزہ کوئٹہ، دیران کرام عبدالکریم شورش، اور آنداد جالندینی

یہ عجیب بات ہے کہ جامِ دُرک نے اپنی محبوبہ کا نام 'ہام' دستور کے خلاف ظاہر نہیں کیا۔ یہ پاسِ ادب تھا یا اُس کا دل اس پر مائل تھا۔ جس کا کوئی نام نہیں۔ جو ذات و صفات سے مبرا ہے؟ یہاں یہ واضح ہونا چاہئے کہ لمبرچی زبان کے شعراء کا عشق خارجی اور اردو شعراء کی طرح محض شخص کی ملیکا کاری نہیں۔ اُن کے کلام میں گوشت پوست کی عورت کی مانوس محبوب شبیہیں ملتی ہیں اور افلاطونی یا متصوفانہ عشق کے بجائے مادی عشق کے قائل اور اُس کے مختلف مظاہر کے ذاکر ہیں یہاں تک کہ معاملہ بندی میں اردو اور فارسی شعراء کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

رازِ دنیا ز حسن و عشق ہم سے پوچھئے : ز گس کی آنکھوں کے ہے میں جن میں ہم
اُن کی محبوبائیں اکاش کی اسپر میں نہیں، اسی زمین کی مخلوق ہیں۔ وہ عرب شعراء کی طرح بنتِ حم سے تو پتنگ نہیں بڑھاتے البتہ اپنے محبوبوں کا نام ظاہر کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے۔ عشق کرتے ہیں، اعلانیہ کرتے ہیں اور اس کی تشہیر سے حفظ حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے مذہب میں عشق نہ گناہ ہے اور نہ تعلقِ خاطر کا اعلان قابلِ تعزیر۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں :-

۱۔ شہرید نے حانی کی مدحت خوانی کی، اپنے تعلقِ خاطر کا اظہار کیا اور چاکرِ اعظم ایسے صاحبِ جاہ و جلال، اور اپنے باپ کی تحفگی اور زرد کوکب سے قطعاً مرعوب نہ ہوا۔

۲۔ بی برگ، گر اس تازہ اور نادر نامی دو شیرازوں سے وابستگی کا ذکر بڑے مزے میں کرتا ہے اور اسے باعثِ ننگ نہیں سمجھتا۔

۳۔ عورتِ پنجووری پیروانی سرِ رخ کی مدحت خوانی اور جذباتِ عشقیہ کے اظہار میں کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا۔
۴۔ مست تو کلی نے اپنی محبوبہ کا نام نہ تو بتایا اور معاشرے کے تاثرات اور ردِ عمل سے بے نیاز منزل منزل اپنے عشق کی داستان بیان کرتا پھرا۔ اور سُمٹو کے نام کی مالا چیتا رہا۔

۵۔ ریحان نے سالو کا نوحہ ایسے انداز میں لکھا کہ اس کا سو گوار دل اور مرگ سوز محبت کا مرقع تیار ہو گیا۔

۶۔ شہداد نے ماہناز کی تعریف و توصیف میں دفتر کا دفتر سیاہ کر دیا اور فلک بدخو کی ستم رانیوں اور کج آرائیوں سے نہ ڈرا۔

لیکن ان عاشقانِ پاک طینت کے برعکس جامِ دُرک نے ہام دستور کے خلاف اپنی محبوبہ کا نام ظاہر نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر کوئی ایک ہوتی تو اُس کا نام لیتا۔ وہ تو محبوبہ وطن کی پرستش کرتا تھا اور بارغِ وطن کا ہر پھول اُسے عزیز تھا۔ خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا تھا۔ باعناط دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی محبت افلاطونی تھی۔ اس خیال کی تائید میں وہ اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں جو سراپائے محبوب کے ضمن میں آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :-

”اُس کی رفتار پر تکنت ہے

اُس کی زلفیں، ایسی برچھیوں کی مانند ہیں جو کسی بھی زرہ بکتر کو چیر سکتی ہیں
اُس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن ہیں۔

اور دور سے چراغ کی لوڑ کی طرح شکار ادبی نظرانی ہیں

وہ نگہت چمنستان کی مانند ہے

نادر ترین ہیرا اُس کی کلائیوں پر وضو فشانے کی نظر آتا ہے

اور وہ لعل اُگلکتی ہے !

دور سے اسراپا ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ جامِ دُرک دھاڑا گیا۔ وہاں اُسے چند زہرہ جینین نظر آئیں۔ جن کے

جھرمٹ میں اس کی محبوبہ بھی تھی۔ درد چمک اُٹھا۔

• ایک دن میں دھاڑ کے پر عظمت دربار میں گیا

وہاں ایک خوبصورت بیکر دیکھا

اُس کا دامن زمین کو جھار دینا جا رہا تھا

اُس نے اپنی زلفوں کو کنگھی سے سنوارا ہوا تھا

اور انہیں سر کے اوپر جوڑا کی شکل میں جمایا ہوا تھا

اُس کے ہونٹ گل لالہ کی طرح سُرخ تھے

اور اُس نے دندانہ سے اُسے رنگا ہوا تھا

اُس کی ناک خنجر کی مانند تھی !

جامِ دُرک اپنے ایک خواب کا بیان کرتا ہے۔ یہاں اُس کی محبوبہ کا سراپا، پہلی دو سے قدرے مختلف ہے۔

• گزشتہ شب عجیب عالم میں

میرنے اُسے دیکھا

وہ بڑی شان و شکست سے میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی

وہ — جو خوبصورتی میں خودوں سے بڑھ کر ہے

اُس کا سر سود کی طرح اٹھا ہوا تھا

اور وہ — جو ہم جلیبیوں کے جھرمٹ میں ملکہ نظر آتی ہے

اور جس کے حسن و شکست کے سامنے سب ہیچ ہیں

وہ ہیر سے اور جوہرات سے لدی ہوئی تھی

لے سے ٹپ لعلیں سے اُسے لعل اُگلکتے دیکھا۔ یا پھر اُس کی سکرابٹ کو لعل کی تابش سے تشبیہ دی گئی ہے (دک)

لے یعنی قدیم زمانے کی شہزادیوں کی طرح اس کا دامن زمین تک آ رہا تھا۔

اور وہ خود ماہِ کامل کی طرح آب و تاب دے رہی تھی
 وہ گھونگھٹ اڑھے ہوئے تھی
 اُس کی شوخ آنکھیں چہرے پر کھلے ہوئے پھول کی مانند تھیں
 اُس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔
 غرض کہ جامِ دُرک نے اپنے محبوب کو مختلف رنگ میں دیکھا اور جس جس رنگ میں اُس نے دیکھا ہے اُس کی نہایت دلکش
 تصویر بنائی ہے۔ اس تصویر میں اُس نے خوں جگر سے رنگ بھرا ہے اور یہی وہ جھلک ہے جسے دیکھ کر ہر شخص پکارا اٹھتا
 ہے کہ جامِ دُرک شہیدِ عشق تھا۔ وہ خود کہتا ہے۔
 ”تم نے اپنی آنکھیں لیوں پر رکھ دی
 اور اس طرح اپنے ایک اشفقہ سر میں کو قتل کر دیا
 تمہارے سینے سے شعلوں نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا!“
 اور ایک جگہ بڑے بڑے فرے میں اشارہ کرتا ہے۔
 ”میں نے ایک باغ میں تین نو عمر طوطے دیکھے
 یہ تینوں — تین موتیوں کی طرح تھے
 یہ اُس پھول کی مانند تھے، جو ہمارے آقا کے باغ میں،
 شاہی سپاہ کے زیرِ نگرانی پروان چڑھ رہے ہیں
 میں نے کہا (یعنی دل کو طفلِ تنہا دی)
 میں یہاں سرِ دادل کے جوگہ میں بیٹھوں گا
 اور اپنی محبوبہ پر نظر رکھوں گا
 میں یہاں سال بھر رہوں گا“
 دوسری جگہ راز و نیازِ حسن و عشق کا ذکر یوں چھیڑتا ہے۔
 ”گزشتہ شب میں نے دل ٹوٹنے والی کو دیکھا
 اُسے دیکھا — جو نسوانیت کا کامل مجسمہ ہے
 اور میں دہن کر گیا ہوا
 دیکھو! بغیر کسی مقصد، یوں جانوروں کی طرح اِدھر اُدھر نہ پھرا کرو!
 اور نہ پروانہ صفت شمع کا اطراف کیا کرو
 (لیکن، ہچکچاہٹ کی زلف پیمپاں کھل گئی)

اور میں نے عاشق صادق کی آواز پر دھیان دیا !

اور میں نے اپنی حسین محبوبہ سے کہا

اے گہرا محبوبہ !

تیری گفتگو میں شکر کی مٹھاس ہے

اور تیری اداؤں میں شیرینی کی دھنسی ہے۔

دیکھو ! یہ حالت اُس بے بس ولاچار کی ہے

جس کا دل تیرے صدمے سے آہ و بکا کرتا ہے !

فرقتِ جاناں میں جامِ دُرک پر کیا کچھ مِٹا، یہ حکایتِ ناتمام ہے اور رُتوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس کی وفات
کن حالات میں اور کہاں ہوئی — قیاس کہتا ہے کہ طعنہٴ نایافت سے بچنے کے لئے جامِ دُرک نے صحرانوردی اختیار کر لی
ہوگی اور پھر وہیں کہیں — عالمِ غربت میں وفات پائی ہوگی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُس کا کلام بہ کل محفوظ نہ رہ سکا ہے

ہاں اہل طلب کون سے طعنہٴ نایافت : دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھواتے
بدھچی زبان و ادب پر تنقیدی نظر رکھنے والے اصحابِ اِلمائے کی خاموشی اور گل خال نصیر ایسے شخص کا دبی زبان میں اعتراف
جامِ دُرک کی زندگی کے اس پہلو کو شک و شبہ سے بالاتر کر دیتا ہے۔ جامِ دُرک نے عشق کیا اور اس کی پاداش میں اپنی زندگی
جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ اسی حسین جرم میں مرزا شیر محمد کے چچا مرزا احمد علی کو قلات چھوڑنا پڑا تھا اور اُس نے بہ دُعا دی تھی۔

ترجمہ : خدا کرے قلات سیوا اُجر جائے

مُن بیتہ سیوا ابر قلات

نئے بانگِ بانیِ مال نے صلوة

واجہاں مادر سے وِرات

نہ وہاں اذان ہو اور نہ نماز

دارِ اُس کے مالکوں کو سانپ ڈس لے

لیکن جامِ دُرک نے اس قسم کی کوئی بددعا نہیں دی۔ وہ اپنے دلِ صمد پارہ کو لئے ہوئے صحرا کو نکل گیا۔ لیکن کبھی کبھی پندار
کا صنم کدہ ویران کئے ہوئے وہ کوچہٴ محبوب میں نکل بھی آیا کرتا تھا :۔

ترجمہ : موری ! اپنی زمرِ حبیبی دُم کو ڈھنگ کے اُپنا سر

اپنے زانو میں ڈال لیتی ہے اور کہتی ہے !

اے میرے شکارِ آقا !

تیری پگڑی میں خراسانیِ مشک ہے

تجھے اللہ تعالیٰ سلامت رکھے

تجھے میں شباشب وہاں پہنچا دوں گی

میرزا کے سامنے !

ڈاھ پڑتے بری و رُو خین و

ڈھنگ کنت موری زامری دُرب

جنت آید سرزاناں ملو کین و

او منی واجہ جینگ و مسکانی

قادر تئی ساہ و رانگہ داربی

من ترا بیگا ہی بیاں اود و

اور ا من میری ڈیر ویر دیا

غرض جام دُر کے متداول کلام کی روشنی میں اُس کی زندگی کے حالات کا ایک خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس خاکے کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے تحقیق و جستجو کے مختلف میدانوں کی خاک چھانی پڑے گی اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ مصلحت وقت سے بے نیاز ہو کر بلورچی زبان کے ادب کی تفسیر و تعبیر سائنسی انداز پر کی جائے۔



تیسرا باب

مداول کلام

بلوچی زبان کے شعری ادب کا سرمایہ اس قدر وسیع و وسیع ہے کہ اس کا بخوبی اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بلوچستان اور ڈیرہ جات کے طول و عرض میں پھرتے رہے ہیں۔ منزل منزل بھٹکے ہیں اور جگہ جگہ گویوں سے سنتے رہے ہیں۔ نہ صرف جامِ بزرگ بلکہ لاتعداد ایسے عظیم المرتبت شاعروں کا کلام طاقِ نسیاں ہو چکا ہے۔ جو اپنے اپنے زمانہ کے فردوسی و جامی، صوفی و خاقانی، حافظ و سعدی، میر و غالب، ملن اور شیلے تھے۔ بلوچی زبان میں ایک (EPIC) رزمیہ جس میں کسی ایک یا چند سوراؤں کے کارناموں کا مسلسل بیان ہو) بھی موجود ہے جسے مرتب و مدون کرنے کا سرو سامان ہو جائے تو مجھے قوی امید ہے کہ یہ یونانی اور ہندی رزمیہ داستانوں، رمان، مہابھارت، ایلڈ، ادیسس، شاہناہ فردوسی وغیرہ سے کم تر نہ ہوگی۔

بلوچی زبان کے شعبی ادب (Folk Literature) کی جانب سب سے پہلے انگریز حکام نے توجہ کی۔ تاکہ وہ قوم کے مزاج اور افتادِ طبع کو بہ لگ سمجھ سکیں۔ اور اس علم کی روشنی میں نظم و نسق کو خوش السلوبی سے چلا سکیں۔ لہذا ابتدائی کام نہایت غیر تسلی بخش ہے۔ البتہ بعد میں مستشرقین اپنے ذاتی شوق اور افتادِ طبع اور کچھ نوک و نود سوسائٹی لندن اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی ہمت افزائی اور امداد سے بلوچی شعری ادب کو جس حد تک قلم بند کر سکے ہیں اور جس عرقریزی اور دقت نظر کے ساتھ مختلف متن اور قرأت کا تقابلی مطالعہ، ترجمہ اور اس پر حاکمہ و تبصرہ کر سکے ہیں، وہ قابلِ قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شمار چیزیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل میں شائع ہوئیں اور ان پر بحث و تمحیص بھی کی گئی۔ نیز نوک و نود سوسائٹی کے رسالہ "فوک لوڈ لندن" میں بھی کچھ چیزیں شائع ہوئی ہیں۔ جو اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہیں۔ اور وہ بلوچی ادبیات کے ہوا خواہ بن گئے۔ اور اس کی چھان بھٹک کی جانب مائل ہوئے۔ اس سلسلہ میں ایس ٹی میر کی تالیف "بلوچ کلاسیکل پورٹریٹ" اور لانگ ورتھ ڈینر کی تالیف "پاپولر پورٹریٹ آف دی بلوچیز" متعلق حیثیت رکھتی ہیں۔

سہ پرورد گرامی علامہ محمد جعفر شاہ صاحب ندوی پھر اردو سے معذرت کے ساتھ "جات" لاحقہ کے ساتھ جمع بنادیا ہوں۔ مجبوراً یہ ہے کہ ڈیرہ جات، اہم علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور ڈیروں، ما، ڈیرے سے مطلب ادا نہیں ہوتا!

ادراں کی اہمیت سے اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے انہوں نے بلوچی شعری ادب کے ایک بڑے حصے کو رومن رسم الخط میں محفوظ کر لیا۔ جو امتدادِ زمانہ سے اگر بالکل ختم نہ بھی ہوتا تو اُس میں یقیناً نمایاں تبدیلی ہو جاتی کیونکہ نہ قدامت نے تحریری ریکارڈ چھوڑا تھا اور نہ بلوچ شعراء بیاض رکھنے کے عادی تھے۔ اُن کی میاض اُن کا حافظہ ہوتا تھا۔ یا پھر اُن کے گوئیوں کا سینہ۔ اور یوں ہی سینہ بہ سینہ چیزیں منتقل ہوتی ہوئیں اب تک چلی آرہی ہیں۔

ڈبیر اور میر کی متبادل کتابوں کے علاوہ یہ شمار چترل، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ادراں میں بکھری پڑی ہیں۔ جنہیں اگر مرتبہ مدون کیا جائے تو ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا۔ انگریز حکام اور مستشرقین کی دیکھا دیکھی سرکار انگلستان کے ہندی نمک خواروں نے بھی بلوچی شعری ادب کو محفوظ کرنے کی سعی کی۔ جن میں رائے بہادر متورام اور دیوان جمعیت رائے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان تمام مساعی کی یافت نہایت معمولی ہے اور میرا یہ بیان بالکل صحیح سمجھنا چاہئے کہ بلوچی شاعری کا ہزاروں حصہ بھی ابھی تک احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکا ہے۔ اور وہ مختلف علاقوں کے گوئیوں کے سینے میں دفن ہے۔

بلوچی زبان کے تحریری ادب کا باضابطہ افتتاح علماء درخوانی نے کیا اور اشاعتِ دین کے جذبے سے سرشار علماء نے مذہبی ادب پر مشتمل کتابوں کا انبار لگا دیا۔ اسی زمانے میں بائبل کے ایک حصے کا ترجمہ بلوچی زبان میں ہوا۔ اور ملا حسنین بخش نے کلام پاک کا نہایت بلند پایہ ترجمہ بلوچی میں کر کے اس زبان کی صلاحیت اور قوت بیان کا ایک لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔ یہ دو بلوچی شعری ادب اور نثری ادب دونوں کے لحاظ سے نہایت قدر رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ لیکن ان علماء حضرات سے یہو یہ ہوا کہ انہوں نے شعبی شاعری کی جانب قطعاً توجہ نہ فرمائی اور نہ انہیں اکٹھا کرنے کی کوشش کی اور نہ مرتبہ مدون کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

قوی بیداری کے ساتھ ساتھ جب بلوچ قوم نے انگریزی تو اس کے لئے غیر ملکی سامراج سے گلو خلاصی کرنا مقدم تھا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ میر یوسف علی خاں کی تحریک انجمن اتحاد بلوچان، انجمن اسلامیہ قلات، انجمن وطن، فیشن پارٹی، بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس سے جو انجمنیں تشکیل پائیں، ان کے نشور میں غیر ملکی سامراج سے گلو خلاصی کے لئے سیاسی جدوجہد کے

سلسلہ بلوچی زبان کے ترکی ابتدا اور ارتقاء کے متعلق دیکھئے۔ میرا مقالہ "بلوچی ادب کا دس سالہ مطبوعہ ماہنامہ آفکاد" کراچی۔ دس سالہ نمبر ۱۹۵۵ء اور نوائے وطن ہفت روزہ کوئٹہ (ایڈیٹر غلام محمد شاہوانی) ۱۹۵۷ء میر یوسف علی خاں کی سیاسی زندگی کا آغاز ایک معنوں تغریاد بلوچستان سے ہوتا ہے جو ہفت روزہ "پہلہ دہلاہ" میں شائع ہوا۔ موصوف کو گرفتار کر لیا گیا اور جرگہ نے ۱۲ ہزار ۹ سو پچیس جرمانہ اور دس ہزار منات نیک ملینی داخل کرنے کی سزا دی۔ اس کے بعد میر یوسف علی خاں باضابطہ انگریز سامراج سے ٹکراتے رہے اور مختلف سیاسی انجمنوں کے روح رواں رہے ۱۹۳۱ء میں میر عبد العزیز خاں کو دی زیر سرکردگی تشکیل دی گئی تھی۔ بعد میں یوسف علی خاں کسی بھی اس میں شامل ہو گئے ۱۹۳۶ء میں میر محمد فاضل محمد شئی سیکریٹری تعلیم ریاست قلات کی سرکردگی میں قائم ہوئی۔ میر علی خاں نصیر مدد منتخب ہوئے اور ملک عبد الرحیم خواجہ خیل خیل سیکریٹری۔ اس انجمن کے فرائض میں نادار طلبہ اور غرب کا شکاروں کی امداد و حمایت سدھار وغیرہ مقام شامل تھے۔ ۱۹۵۵ء خان بابا اور عبدال

کے لئے
سلسلہ
بلوچیت
پر تنقید
کی شاہ
انہیں
چلتی
گی۔
نے

مراجع
طور
از برقم
اب
شعراء

شامل
دف
کا کرا

ہوئی
اس کے
جملہ
جملہ
۱۹۵۵ء

کے لائحہ عمل شامل تھے۔ لیکن بلوچی زبان و ادب کی نشو و ارتقاء اور بلوچ تہذیب کے تحفظ و بقا کا کوئی تصور نہ تھا۔ اور نہ اس سلسلہ میں انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی کام ہوا۔ بلوچی زبان و ادب کی نشو و ارتقاء کو وسیع و اشاعت اور تحقیق و جستجو کا افتتاح بلوچستان رائٹرز ایسوسی ایشن کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ بلوچستان کی تاریخ میں یہ پہلی ادبی انجمن تھی۔ جہاں بلوچی شعرا و ادب پر تنقید و تبصرو کیا جاتا تھا۔ اور بلوچی زبان کے شعراء وادباء بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اسی کے بطن سے "بلوچی وایوان" کی شاخ پھوٹی اور بلوچی زبان و ادب کی شعوری ترقی کا دور شروع ہوا۔ اور میراث بلوچوں کی چھان پھٹک کے ساتھ ساتھ انہیں محفوظ کرنے کی بھی زبردست کوشش شروع کی گئی۔ اس سلسلے میں "نوائے وطن"، "ادمان"، "بلوچی"، "خاور"، "ایشیا"، "افکار" "ملتان" اور بلوچی دنیا وغیرہ کی مساعی بھی قابل ذکر ہے۔ جن کی کوششوں سے معتد بہ مقدار میں بلوچی شعری ادب کا سرمایہ جمع ہو گیا۔ غلام محمد شاہوانی مرحوم نے "عانی دشت مرید" کی منظوم عشقیہ داستان کو معارف و ترجمہ مدون و مرتب فرمایا تھا راقم السطور نے مسودہ دیکھا تھا۔ قریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل یہ داستان تھی لیکن ان کی ناگہانی وفات نے اشاعت کی منزل نہ آنے دی۔ مختصر یہ کہ جو چیزیں احاطہ تحریر میں گزشتہ سو سال میں آئی ہیں۔ ان پر نگاہ بازگشت ڈالی جائے تو وہ بلوچی شاعری کے سوانح دریا کی ایک لہر بھی قرار نہیں پاتیں۔ اور ان سے لاکھوں گنا سرمایہ ابھی تک گویوں کے مافیلے میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر "جنگ نعلین" پر گید و دوم نے ایک ہزار اشعار پر مشتمل رزمیہ لکھی تھی۔ اس کے پوتے عظیم (غالباً عطا) کو یہ رزمیہ داستان ازبقتی جس سے سن کر میرزا بخش خاں غزنی نے سوا اشعار قلب بند کئے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل میں مع ترجمہ شائع ہوئے اب نہ جانے کہاں کے اس گھر نے میں کوئی ایسا شخص موجود بھی ہے یا نہیں جیسے یہ رزمیہ داستان ازبہ ہو۔ یہی حال دوسرے شعراء کا ہے۔

جام ڈرک کا معاملہ برعکس ہے۔ اس کا کلام مٹا نہیں۔ پانچ نفلیں دتیر نے اپنی کتاب "دی پاپر پوٹری آف دی بلوچیز" میں شامل کی ہیں۔ دی محقق سرمایہ ہے۔ نیز کچھ اشعار مختلف لوگوں کی بیاضوں میں پائے جاتے ہیں۔ بشیر احمد صاحب منظر از ہیں۔

دفٹ نوٹ بسلسلہ (۳) خان اچکزئی نے ۱۹۳۳ء میں تشکیل دی اور اس سال "استقلال" ہفت روزہ اخبار کا اجراء کیا۔ یہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ نہ تھی۔ البتہ آزادی وطن اور بیرونی سامراج سے گلو خلائی کیلئے کانگریس سے اشتراک عمل رکھتی تھی ۱۹۳۳ء کو قائم ہوئی ۳۵ پہلی کانفرنس ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس میں بلوچستان اور دیگر علاقوں کے بلوچوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۳۵ یہ بلوچی، پشتو، بھائی، اردو شعراء وادباء کی ادبی جماعت تھی۔ اوائل ۱۹۳۵ء میں تشکیل دی گئی۔ کمال القادری ۱۹۳۵ء تک جنرل سیکریٹری رہے اس کے بعد حضرت رفیق راز سیکریٹری مقرر ہوئے ۳۵ ہفت روزہ کوئٹہ جو غلام محمد شاہوانی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا گل خاں نصیر اور عبد اللہ بھٹانہ کمال دینی ادارہ تحریر میں تھے ۳۵ ماہنامہ کراچی جس کی ادارت خیر محمد دی صاحب فرماتے ہیں ۳۵ ماہنامہ کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ جس کی ادارت آزاد کمال دینی کرتے تھے ۳۵ ہفت روزہ کوئٹہ جس کی ادارت میثم اثم ملک اور کمال القادری کرتے تھے ۳۵ ماہنامہ کراچی مدیر صاحبہ لکھنوی ۳۵ اس کا ۳۵ میں اجراء ہوا۔ پاکستان بلوچ ہسٹوریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ مدیر چاکر خاں زند۔

”جیسے کہ بلوچی دفتار کے اور اشعار اکٹھے کئے گئے، جام کے اشعار اکٹھے نہیں کئے گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے گفتار کے کتنے حصے باقی رہ گئے ہیں اور کون سا حصہ گم ہو چکا ہے۔“

(جام ڈرک، مطبوعہ اولس، کوئٹہ شمارہ نمبر ۱۲)

نہ معلوم وہ کونسا بلوچی دفتار ہے جس کی جانب بشیر احمد صاحب اشارہ فرما رہے ہیں؟ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ ابھی تک بلوچی شاعری کا ایک ادنیٰ حصہ بھی اساطیر تحریر میں نہیں لایا گیا۔ خصوصاً جام ڈرک کی شاعری کے متعلق تو ہمارا علم نہایت محدود ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تسلیم کی جاوے اور امیر عثمان ایسے ذمہ دار حضرات تھے بغیر کسی دلیل کے مندرجہ ذیل نظموں کو جام ڈرک سے منسوب کر دیا ہے:

۱۔ دوستیں اور شیریں

۲۔ عیسیٰ اور بڑی فقیر

۳۔ کبوتر اور باز

۴۔ پریاں

۵۔ نہانی عورتیں — وغیرہ وغیرہ

مذکورہ بالا نظموں ڈنکر کی کتاب میں موجود ہیں۔ لیکن اس نے انہیں جام ڈرک سے منسوب نہیں کیا ہے۔ یہاں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ڈنکر گو غیر ملکی تھا، لیکن بلوچی زبان اور شعری ادب پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ نیز اسے جہاں کہیں شبہ ہوا ہے اس نے صراحت کر دی ہے کہ یہ نظم گو بی برگ سے منسوب کی جاتی ہے، لیکن ”ڈکشن“ اور انداز بیان کے لحاظ سے جام ڈرک کی معلوم ہوتی ہے۔ نیز اس نے ہر نظم سے پہلے ایک مختصر تعارف لکھا ہے۔ جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ کس علاقے سے اس نے یہ نظم حاصل کی ہے۔ کس سے سنی ہے اور کتنے متداول متن موجود ہیں۔ نیز ان متون میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ نیز نیز ہر شعر نام اور دوسرے ماخذات بھی اس کے پیش نظر تھے۔ اور اس نے تمام کو جذب کرنے کے بعد تقابلی مطالعہ کے ساتھ اپنی کتاب مرتب و بیان کی ہے۔ لہذا اس کی واضح رائے کے پیش نظر تسلیم خاں گئی اور امیر عثمان صاحب کا یہ انداز درست معلوم نہیں ہوتا اور اس دعوے کی بظاہر کوئی اساس بھی نظر نہیں آتی یہ

۱۔ برادر ملک محمد پناہ کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ اس خیال کا اظہار برادر ملک خاں نصیر نے کیا ہے۔ میرے پیش نظر گل خاں نصیر کے دلائل و براہین نہیں کہ اس پر تبصرہ کیا جانا ممکن ہو۔ بالخصوص اگر محض داخلی شہادت کی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے تو یہ مسدود متنازعہ فیہ ہے۔ کیونکہ اکثر نظموں کا معیار جام ڈرک سے بہت ہے اور اس کے پیرایہ بیان، فرہنگ شعری اور رنگ سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں پڑ سکتی۔ بات یہ ہے کہ بشیر احمد صاحب نے جام ڈرک کی سینہ نظموں کا ایک مجموعہ ”ڈرچیں“ کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جسے سندھی ادبی بورڈ شائع کر رہا ہے۔ اس مجموعہ میں مذکورہ نظموں شامل ہیں اور بغیر کسی تکلف کے انہیں جام ڈرک سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ انہیں — (باقی صفحہ ۳۳)

نمبر

اس کی

—

دبند

کے

میں

تحقیق

میں

میں

ڈنکر

درج

ڈنکر

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

مضامین

اُس کا رنگ لاکھوں میں پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح میر تقی میر زانو شہ غالب یا اقبال کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ اور یہ شعراء ایک مخصوص عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جامِ درک کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے ایک مخصوص پیرایہ بیان ہے۔ مخصوص فرنگ شعری و دیکشن ہے، مخصوص استعارات و تشبیہات (امیجری) ہیں اور وہ ایک مخصوص عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہم اگر میر غالب اور اقبال کو ملا دیں اور پھر انہیں الگ الگ کرنا چاہیں، تو بغیر کسی وقت محض ان کے رنگِ کلام کی انفرادیت کی وجہ سے اُسے علیحدہ علیحدہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جامِ درک کے اشعار بھی انٹراویوں صدی کے دوسرے شعراء سے بالکل منفرد رنگ رکھتے ہیں۔ اور دوسروں کے کلام سے انہیں کوئی مناسبت نہیں۔

اب ایک ہی عہد کے تین باکمال شعراء غالب، مومن اور ذوق کی مثال لیجئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے انفرادی رنگ کے کلام کو ہم نہ پہچان سکیں۔ اور مومن کی غزل کو ذوق کی اور ذوق کی غزل کو غالب سے منسوب کر دیں؟ قطعاً ایسی بوجہ عجیب ادبی تنقید میں ممکن نہیں لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایک طرف "حلی و بری" "کبوتر اور بانڈ" اور "پری" ایسی پچھلی نظموں کو جامِ درک سے منسوب کیا گیا ہے اور دوسری طرف "دوستیں و شیریں" ایسی نادر مثال نظم کو جامِ درک کا قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ غور نہیں کیا گیا کہ ان نظموں کے متعلق ڈیز کو ذرا بھی شبہ گزرتا کہ یہ جامِ درک کی ہیں تو وہ کم از کم اپنے احساسات کا اظہار ضرور کرتا۔ ڈیز نے ان نظموں کے مصنف کا نام نہیں بتایا ہے۔ جس سے سلیم گئی اور امیر عثمان صاعب نے انہیں بے تکلفی سے جامِ درک سے منسوب کر دیا۔ اس بے احتیاطی سے جامِ درک کے ادبی مقام کو حد درجہ پہنچ سکتا ہے۔

اب ان نظموں کے متعلق ڈیز کی صراحت ملاحظہ فرمائیے:-

۱۔ دوستیں و شیریں :- یہ نظم پہلی مرتبہ ۱۸۶۶ء میں شیمانی سے سن کر قلمبند کی تھی۔ پھر مرلی کے علاقے سے حاصل کردہ نظم سے اضافہ کیا۔ اور دو دیگر مآخذات سے اس کا تقابل کیا۔ یہ نظم پہلی مرتبہ میرے مضمون "بلوچی زبان کا نمونہ" (اکٹرا نمبر جے، اے، ایس، بی ۱۸۸۱ء) میں شامل کی گئی اور پھر ٹکٹ نمک میں بھی بارپائی۔ نثر و نظم دونوں کا ترجمہ نوک لورڈ (لندن) میں ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔

دوستیں اور شیریں کی رومانوی کہانی اس دور سے متعلق بتائی جاتی ہے۔ جب میر چاکر خاں زند اور ترکوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ نثری کہانی غلام محمد بالا جانی نے تحریر کی ہے۔

۲۔ نہاتی عورتیں :- اس نظم کے مآخذ کے متعلق کوئی روایت مشہور نہیں۔ یہ نظم میں نے سلسلہ ہائے کوہ لغاری سے ۱۸۸۲ء میں حاصل کی۔ ڈیکھو درہ بولان کے اطراف میں بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہ نظم بلوچی شاعری میں بے مثل ہے۔ کیونکہ اس نوع کی ایمائیت (symbolism) بلوچی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ نظم ترکمانی نظموں سے ملتی جلتی ہے، جسے پوڈو

سہ میں نے اس داستان کو از سر نو ترتیب دیا ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے میرا مضمون "Pledge versus Love" مطبوعہ "مورنگ نیوز" منڈی ایڈیشن کراچی، ڈھاکہ، نیز رسالہ "نثری پاکر" ۱۹۹۱ء شمارہ نمبر ۱۹۹۱ء دیکھئے۔ ترجمہ مطبوعہ "مذاہف" - ۱۹۹۶ء

دیا پور لہ پور

۳۰

جو علاقہ

۳۱

میں کا تر

لندن

یہج سے

ترجمہ کید

کی قراء

مطلوب

کیونکہ

دن ایک

نکست

محض کو

منور

واقع

کرنے

ایسی

اور کہ

مطابق

کی نظر

کیا

دہلی پرنٹری آف پرنٹنگ پریس نے ترجمہ کیا ہے۔

۳۔ پیریاں :- نظم کا موضوع پریوں سے ایک ملاقات ہے، یہ ملاقات سلسلہ ہائے کوہ سلیمان کی ایک چوٹی "اکبائی" جو علاقہ لغاری میں واقع ہے، میں ہوئی

۴۔ عیسیٰ اور بڑی :- یہ مختصر نظم بلوچی شاعری کے دوسرے نمونوں سے بہت زیادہ معروف ہے۔ بیچ نے تن اور اس کا ترجمہ چھپوایا تھا۔ اور برٹن نے اس نظم کا ایک ترجمہ سندھوی ڈیٹڈ (Sindh Review) جلد ۲ ص ۱۶۵ (نندن ۱۸۷۷ء) میں شائع کیا جس کا بلوچی متن نہیں ملا۔ کیونکہ اس نے دوسرے صفحات پر کچھ اشعار اپت ماندہ قابل سے متعلق بیچ سے مستعار لئے ہیں۔ اور بغیر حوالے کے آزاد ترجمہ پیش کیا ہے۔ (دیکھئے ۲۱۰) بہر کیف اس نے "عیسیٰ اور بڑی" کا جو ترجمہ کیا ہے وہ نہ بیچ سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ میرے پیش نظر جو بلوچی متن سے میں نے یہ نظم ۱۸۷۷ء خدائش مری ڈیم کی قرأت پر اعلا کیا ہے۔ اس وقت میں بیچ کی تصنیف سے آگاہ نہ تھا۔ سٹریمر نے "بلوچ کلامک" میں اس کا ایک سرا طول متن شائع کیا ہے (صفحہ ۳۳) میرے پیش نظر یہ تینوں متن تھے۔ اور ان سے تطابق کی کوشش کی ہے۔

نظم گاتے ہوئے یہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ "درخت کی کہانی یہ ہے" غالباً یہ اشعار حقیقی نظم کا حصہ نہیں کیونکہ یہ اصل نظم کے بہانہ سے مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ادنیٰ مغالطہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ بقیہ نظم کا جہاننگ تعلق ہے ایک درخت کے معجزہ نشوونما کے متعلق میدھی سادی کہانی ہے۔

۵۔ یاد اور کبوتر :- یہ نظم غلام محمد بالاچانی کی قرأت پر میں نے ۱۸۸۲ء میں اعلا کی تھی۔ اور یہ میری کتاب بلوچی کتب ۱۸۹۱ء میں شامل تھی۔ لیکن اس کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔

تحقیق و تدقیق کے اس اعلیٰ معیار کے سامنے امیر عثمان - گئی، امان اللہ گہکی یا بشیر احمد صاحب کے دعوائے حق کو علمی ستم ظریفی سے زیادہ وقعت نہیں دی جاسکتی۔ مذکورہ نظمیں اگر جام و رک کی ہوتیں تو انہیں اس کے نام سے سب کرنے میں یقیناً ڈنیز کو کوئی قباحہ نہ ہوتی، کیونکہ وہ زبان کا مزاج دان تھا اور عہد بہ عہد زبان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں، ان سے بھی بے خبر نہ تھا۔ نیز وہ مختلف شعراء کے رنگ سخن کو بھی پہچانتا تھا اور ان کے مابین تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ پھر یہ بھی غور طلب امر ہے کہ ان نظموں کے مصنفین کے متعلق سو برس پہلے جب کوئی روایت یہی نہ مل سکی جس سے ان کے مصنفین کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکتی تو پھر آج کیونکر روایت تسلیم کر لی گئی۔ نیز باز مذکورہ میں حضرت علی سے متعلق جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ اور نہ اسلامی روایات و تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہے، یہ نظم بودھی تعلیمات کی آئینہ دار ہے اس موضوع پر انگریزی شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں آر۔ ٹی گریفیٹھ کی نظم "The suppliant Dove" میرے پیش نظر ہے۔

میری گزارشات سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ ڈنیز نے جو کلمہ زیادہ سرمو صحیح ہے، صرف اتنا عرض ہے کہ ڈنیز نے بلوچی شاعروں کا جو انتخاب شائع کیا ہے اسے سو سال ہو چکے ہیں۔ اور اس پر نظر ثانی کرنے کیلئے مبادیات تحقیق اور اصول محاکمہ سے باخبر سرمو بغیر کسی قسم کی رائے ذاتی قابل قبول نہیں ہے۔

چوتھا باب

زبان

جام دُرک کی زبان کم آمیز زندگی صاف و شستہ زبان ہے، فصاحت و بلاغت اُس کے گھر کی کنیزیں اور وزیرہ محاورات اُس کے آبائی خدام ہیں۔ اور چونکہ وہ قلات کے اطراف و جوانب میں پیدا ہوا۔ پلا بڑھا اور دل کی آتش سے مجبور ہو کر شاعری کا ایوان آراستہ کیا۔ اس لئے اُس کی زبان، تلفظ و املاء کے اعتبار سے غیر بلوچی الفاظ سے آلودہ نہیں۔ اور نہ اُس کی زبان کی لطافت و علاوت، تشبیہات و استعارات کی ندرت و کیفیت اور نہ فرہنگ شعری کی نزاکت اور نہ محاکات کی رنگینی و رعنائی میں غیر جنسی ادبے میں رنگ کا استخراج ہوا۔ جام دُرک اپنی زبان اور اپنی شاعری کی حقیقت سے آگاہ نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

گالوں کو شغفت
دروں سپخت
لعلوں رُپخت

ترجمہ: "میں نے سخن سرائی کی ہے
میں نے موتی پروئے ہیں
میں نے لعل سمیٹے ہیں!"

بلوچی زبان، جیسا کہ ماہرین لسانیات کا محقق فیصلہ ہے اور جس پر اتفاق رائے ہے، وسطی فارسی کی ایک شاخ ہے۔ ڈنیر لکھتا ہے۔

"بلوچی السنہ مشرقی ایران کی ایک زبان ہے، جس کا سرعشہ مشرقی ایرانی شاخ ہے۔ ہر چند بعض چیزوں میں اوستا سے کہیں زیادہ قدیم فارسی سے مماثلت رکھتی ہے۔"

مدحیثیور و رہا لکھتا ہے۔

"بلوچی وسطی فارسی کی ایک شاخ ہے۔" (داریائی زبانیں)

میر عبد الصمد امیری نے ایک مدال مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ بلوچی قدیم ترین انفرادی حیثیت

۱۔ دیکھئے میر مقالہ "سفری پاکستان کی زبانیں اور اردو کی تشکیل" جدید مطبوعہ "امروز" لاہور ۳۱ مارچ ۱۹۵۷ء دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام انگریزی ایڈیشن باب بلوچستان ۱۷ دیکھئے ماہنامہ "بلوچی" کراچی۔

رکھنے والی زبان ہے۔ اور اسے اُمّ اللسان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے کتبہ بے ستون سے استنباط کیا ہے۔ پھر شیر محمد مرکی نے اسی نظریہ کو اپنی کتاب ”بلوچی زبان و ادب“ میں نہایت طعنان سے پیش کیا۔ اور اس قدر غلو سے کام لیا کہ وہ یہ یاد دلاتے ہیں کہ بلوچی زبان کے بطن سے فارسی و سنسکرت کا ظہور ہوا ہے۔

افراط و تفریط سے قطع نظر ابھی تک اس نظریہ کی کوئی علمی حیثیت مستند نہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتبہ بے ستون میں چند ایسے الفاظ یقیناً موجود ہیں، جو بلوچی میں مروج ہیں۔ لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ علماء لسانیات بلوچی کو وسطی فارسی کی ایک شاخ تسلیم کرتے ہیں۔ لہذا قدرتی طور پر بلوچی میں فارسی زبان کی معتد بہ مقدار میں فرہنگ پائی جاتی ہے۔

بلوچستان میں جب بلوچ آئے تو اپنے ساتھ وہی زبان لے کر آئے ہوں گے جن کی جھلکیاں ہمیں چاکر اعظم کے عہد کے شعراء کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ لیکن بعد میں جب بلوچوں میں انتشار پیدا ہوا اور مرکزیت ٹوٹ گئی تو زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور دوسری بولیوں کے اثرات رونما ہونے لگے۔ لہذا بلوچی زبان کی مندرجہ ذیل بولیاں پائی جاتی ہیں:-

۱۔ مشرقی بولی:- یہ کبھی اور اس سے ملحقہ سلسلہ ہائے کوہ سلیمان، اصلاح ذریعہ غازیخان، جلیک آباد اور پنجاب کے بلوچ قبائل میں مروج ہے۔ نیز دریائے سندھ کے مغربی ساحل پر آباد مزاریوں اور سرادان کے کچھ برہمنوں کی بھی یہی زبان ہے۔

۲۔ مغربی بولی:- یہ ایرانی بلوچستان، پاکستان کے علاقہ کرمان، اور مغربی و جنوبی ضلع قلات میں بولی جاتی ہے۔ نیز خوافین قلات کے خاندان کی زبان ہے۔

وہ بولی جو سیستان، خاران، دشت لوت کے علاقے میں آباد بلوچ بولتے ہیں۔ انہیں ایک الگ بولی گردانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ صوتی لحاظ سے وہ مشرقی و مغربی بلوچی بولیوں سے قدرے مختلف ہے۔ لیکن حتمی طور پر اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے لئے ابھی ان علاقوں میں رائج بولی کے تجزیہ و تحلیل اور مزید معلومات فراہم کرنے کا جاں گز ماحول باقی ہے۔ ٹھیک اسی طرح دادی ہند اور اس سے ملحقہ افغانستانی علاقوں میں آباد مینگل قبائل کی بولی انفرادی حیثیت کی مالک ہے اور اسے مطالعے کے لئے ایک الگ حلقہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

پھر ان بولیوں میں بھی تہمتی فرق رونما ہو چکا ہے، جنوبی علاقے میں بولی جانے والی مشرقی بلوچی کے خواہد اشکال

سہ بلوچی سرورق ہے، ”بلوچی زبان و ادب و تاریخ“ یہ ”کل پاکستان“ یہی زبان کانفرنس لاہور۔ اپریل ۱۹۶۱ء اور شیر محمد مری بلوچ مطبوعہ کاردار بلوچی اکیڈمی منگھو پیر روڈ، کراچی ۱۶۔ سہ ”لوت“ بلوچی لفظ ہے۔ بمعنی ویران، اجاڑ، میرے خیال میں یہی درست ہے۔ اور ”دشت لوت“ سے اولاہ کرنا درست نہیں (دک)

دھرتی و سحر) اصل شکل میں برقرار ہیں۔ اور صدیقیاتی لحاظ سے فرسنگ میں نمایاں فرق نہیں ہوا۔ لیکن شمالی علاقے میں آباد بلوچ
 گر مشرقی بلوچی ہی بولتے ہیں۔ لیکن صوتی لحاظ سے اُس میں نمایاں فرق رہا ہوا چکے۔ مغربی بلوچی میں بھی ایرانی بلوچستان
 کی بولی پر فارسی (جدید ایرانی) کا اثر غالب ہے، اور قلات کے قرب میں یہ اثر بہت کم ہو جاتا ہے۔

گنیر پرتن نے ان اختلافات پر دقت نظر سے بحث کی ہے اور اس کی نکتہ شناس نگاہوں نے ادنیٰ ادنیٰ فرق کو بھی دیکھ
 لیا۔ نیز ڈیمز نے بھی تفصیل سے صدیقیاتی تبدیلی اور تلفظ کی نزاکت سے بحث کی ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اہل زبان
 بخوبی جانتے ہیں کہ مشرقی و مغربی بولیوں اور مختلف علاقوں کے تلفظ میں کیا تغیر و انقلاب رہا ہوا چکا ہے اور اس سے
 زبان کی لطافت کس قدر متاثر ہوئی ہے۔ نیز شعرد سخن کا ذوق سلیم رکھنے والے حضرات اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ
 ادب، خصوصاً شاعری میں زبان کا برتنا کس قدر مشکل امر ہوتا ہے۔ ہر لفظ کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مترادفات
 و مترادفات بھی مزاج و تاثیر کے اعتبار سے کیفیت و کسب میں مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا شعراء الفاظ کے چناؤ میں بڑی احتیاط
 برتتے ہیں پھر اب بھی اثر آفرینی اور تزیین خیال میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مقامات پر زبان
 کی گنت ہی مزہ دیتی ہے اور اس گنت زبان میں گفتنی و ناگفتنی سب کچھ ادا ہو جاتا ہے۔

بات ادھوری اثر دونا
 اچھی گنت زبان میں آئی دیکھنا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم کسی ایسے شاعر کا کلام جو مشرقی بلوچی میں ہو، مغربی بلوچی میں املا کریں تو اس کا
 مفہوم بدل جائے گا؟ میرے خیال میں مشرقی و مغربی بلوچی میں اس قدر بعد نہیں، البتہ بے خوف تر دید یہ دعویٰ کیا جاسکتا
 ہے کہ بعض مقامات پر اسلوب و آہنگ کی تبدیلی سے تاثر میں فرق پیدا ہو جانے کا احتمال ہے اور الفاظ کے چننا و
 در دبست، تشبیہات و استعارات کے استعمال، محاورات اور روزمرہ کے برتنے وغیرہ میں جو شاعرانہ التزام بالعموم کیا جاتا
 ہے، اُسے مدبر یقینی طور پر تبدیلی املا اور مبادل الفاظ کی تبدیلی سے پہنچے گا، نیز صوتی ہم آہنگی اور آہنگ شعری بھی متاثر
 ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

جام دُرک کی زبان بلاشبہ مشرقی بلوچی تھی۔ دوسری دُرگفتار مشہور ہیں۔ اور فصاحت و بلاغت اُن کی گھٹی میں پڑی
 ہے۔ لہذا میری رائے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا کلام مشرقی بلوچی ہی میں املا کیا جائے۔

میرے پیش نظر جام دُرک کے اشعار ایک سے زیادہ انداز میں املا کئے ہوئے ہیں۔ اور یہ صورت حال مناسب
 نہیں۔ نیز، بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض حضرات رد من رسم الخط میں قلمبند نظموں کو موجودہ بلوچی رسم الخط میں منتقل کرتے
 ہوئے جب کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تو اُس کی جگہ جھٹ سے کوئی لفظ موقع کی مناسبت سے جڑ دیتے ہیں۔ یہ رجحان براہم
 اور نہایت غلط ہے۔ دُنیا کا کوئی ایسا شخص نہیں جسے کسی زبان کی نعت حفظ ہو۔ لہذا ممکن ہے کہ ایک لفظ جو بظاہر ناقابل فہم

نظر آ رہا ہے، کسی دوسرے شخص کے لئے گنجینہ معنی ہو۔ لہذا اس سلسلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور دیانت و علم دوستی کا تقاضا ہے کہ اُسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ ہاں حائے میں اپنے احساسات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جامِ دُرک کی نظمیں ڈینے مشرقی بلوچی میں املا، (رومن رسم الخط میں) کی ہیں۔ اور میرے خیال میں یہی مناسب ہے۔

جامِ دُرک کی صاف و شستہ زبان کی تعریف میں ہر کوئی رطب اللساں ہے۔ خواہ وہ زبان کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہے یا نہیں۔ اُس کی فصیح و بلیغ زبان اور شرکت الفاظ اور اچھوتے استعارات اور ندرت خیال کی صفت بیان کرتے کرتے ہر ایک کی زبان خشک ہو جاتی ہے۔ مثلاً بشیر احمد صاحب لکھتے ہیں:-

• ”جامِ دُرک زندہ ہے۔ کیونکہ اٹھارہویں صدی سے آج تک اُس کی باتیں بے مثال ہیں۔ اُس کی

اختیار کی ہونی نئی طرز کی شاعری نے بلوچی زبان کو نعل و گہر سے پر کر دیا ہے۔“

• ”شاعری کا ایک نیا انداز جو جامِ دُرک نے اختیار کر لیا تھا، بلوچی زبان و ادب کے لئے ایک نیا راستہ

تھا۔ ہماری قدیم شاعری میں شاعروں نے محبوب کی صفت و ثنائیں کئی ایک مزیدار باتیں کہی ہیں لیکن

جامِ دُرک اپنی ذات اور اپنے دوست کو ایک نہ ٹوٹنے والا بندہ قرار دیتا ہے۔“

• ”جامِ دُرک زبان اختیار کرتا ہے جو کسی کی زبان ہو، وہ ٹھوڑے الفاظ میں لمبی داستان بیان کر لیتا ہے

دوست کا سراپا ہو یا اُس کی جدائی۔“ (ماہنامہ ادب و ادبیات نمبر دسمبر ۱۹۷۷ء)

اور سلیم گئی صاحب لکھتے ہیں:-

”اُس نے فارسی یا کسی دوسری ایشیائی زبان کے الفاظ، محاورے یا استعارے تک مستعار نہیں لئے۔

وہ اپنے مضامین کے لئے دادی بولان سے باہر نہیں جاتا، اپنے ماحول اور فضا سے اثر لیتا ہے اور

اسے کول اور زل الفاظ میں سمو کر دواقتہ بنا دیتا ہے۔ اُس کے گیتوں کی محبوبا میں چوگا ہوں

میں بھیڑ جاتی ہیں۔ آبشاروں سے شکنجہ دل میں پانی لاتی ہیں اور حسین و دلنواز دایوں میں گھومتی پھرتی

الہر دشتیزائیں ہیں۔“

• سوہویں اور تیرہویں صدی کی بلوچ شاعری زیادہ تر بلوچی کی طویل رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس عہد

کی شاعری میں تغزل کا عنصر بے حد کم ملتا ہے۔ طویل رزمیہ نظموں میں جنہیں بلوچی میں ”شیر“ کہا جاتا ہے

وہی رنگ لئے ہوئے ہیں جو پشتو میں ”چهار بیتہ“ بنگالی میں ”جنگ نامہ“ اور پنجابی میں ”مد“ اور دواڑ کا

ہے۔ جامِ دُرک پہلا شاعر ہے جس نے تغزل اور تصوف کو اپنا موضوع فکر بنایا ہے اور بعض ایسی

نظمیں بلوچی زبان کے شعری ادب کو دی جو واقعی شاہکار ہیں۔“

اور امیر عثمان رقمطراز ہیں :-

..... بنیادی طبع پر وہ تغزل کا شاعر تھا۔ اُس کی نظموں میں محبوب کے حسن و جمال، آرائش و زیبائش اور رفتار و گفتار کو نہایت مستحضرے اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جام دُرک بلوچی زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے شعر و نغمہ کی بنیاد ٹھوس حقائق پر رکھی۔ اُس کا شاہد نہایت عیسق ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ ایک سچے فن کار کی حیثیت سے اُسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔“

اور شیر محمد مری بلوچ لکھتے ہیں :-

”گوں استین اور دین آل دئی شاہری گالاں کومری آن علو کنت بے...“

واقعہ یہ ہے کہ جام دُرک کی زبان فصاحت و بلاغت اور لطافت و صباحت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ایجاز و تعمیم میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔ اہل سخن بخوبی جانتے ہیں کہ باتوں کو پھیلا کر بیان کرتے کے بجائے اُسے سمیٹ کر چند مصرعوں میں ادا کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جام دُرک کا جوہر اسی مشکل زمین میں کھلتا ہے۔ وہ چند مصرعوں میں اور موضوع دریا کی تمام کیفیات رنگ رنگ کی خبر لاتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو اُسے دوسرے بلوچی شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

طبعاً بلوچ تفصیل طلب واقع ہوئے ہیں۔ وہ اشارات و کنایات میں گفتگو کرنے کے بجائے حال احوال کرتے ہیں۔ اُن کی رزمیہ اور عشقیہ داستانوں سے قطع نظر کبھی لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ٹوری میں بھی اس قدر طول بیانی سے کام لیتے ہیں کہ داستان کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ”داستان گشت“ کے سوا کوئی مختصر صنف سخن نہیں۔ عشقیہ نظموں میں اکثر طویل اور داستان کا رنگ لے ہوتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس میدان میں تجزیات نگاری کے وہ ایسے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ آنکھیں خیر ہو جائیں۔ وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی اس طرح کھول کر بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ایک متحرک مرقع آ جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ واردات قلبی اور خصوصاً بیانِ عشق اس تفصیل کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ یہ تو وہ منزل ہے جہاں براہ راست اشارات و کنایات بھی طبیعت لطافت پسند پر گراں گزرتے ہیں۔ لہذا انفاست پسند صاحبانِ دل نے ایک اور راہ اختیار کر لی ہے۔

نوشتر آں باشد کہ ستر دلباں : گفتہ آید در حدیث دیگران

جام دُرک نے درمیانہ روی اختیار کی ہے اور کہیں کہیں غم جانناں کے رنگ میں غم دوراں کو بھی پیش کیا ہے اور جہاں وہ حدیث دیگران کا انداز اختیار کرتا ہے تو اُس کی زبان لعل و گہر بکھیرنے لگتی ہے :

سہ ماہارہ ”ادبی دنیا“ لاہور، دورِ پنجم، شمارہ ہفتم، ۱۹۷۷ء ”بلوچی زبان و ادب“ بتاریخ ”مطبوعہ کاردار بلوچی اکیڈمی منگلور، پر روڈ کراچی“ (مراد) ”جام دُرک اپنی شاعری میں اپنی محبوب کا سراپا کھینچتا ہے اور اسے سرو اور غنم قزح سے رنگ دیتا ہے۔“ تین بمعنی

پانچواں باب بشنوائے

شاعری کیسے؟ ہر دور میں اس مسئلہ پر غور و غرض ہوتا رہا ہے۔ اور ہر زبان کے ناقد ان فن نے اپنی اپنی بساط کے مطابق شاعری کی تعریف کی ہے اور پھر بھی اس کی تعریف باقی ہے۔ اگر ان تمام تعریفوں کو یکجا کر کے دیکھا جائے، جو مختلف عہد کے علماء و فضلا، اور ناقدان ادب نے فرمائی ہیں تو ہمیں افلاطون سے لے کر عطا شاہ تک ان میں چند چیزیں مشترک نظر آتی ہیں۔ اور ان مشترک اقدار کے پیش نظر شاعری کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:-

شاعری اپنے جوہر کے لحاظ سے زندگی کی اُس جذباتی اور تخیلی تفسیر و تعبیر سے عبارت ہے، جو کسی شاعر کے دماغ میں گھر کرتی ہے اور وہاں نشو و نما لے کر ایک خاص دروہیت، نظم و ضبط اور سخن و آہنگ کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر شاعری کسی شخص کے تجربات و مشاہدات (جو کسی خاص مسئلہ یا موضوع کے متعلق ہوں) کا ایک ایسا ہم گیری اور جامع نتیجہ ہے جس کا اظہار جذبہ قدرت متخیلہ اور فکر و وجدان کے مناسب امتزاج کے ساتھ ہو۔ لہذا اس تعریف کی مدد شاعری میں بلوچی شاعری کو بلحاظ معنی و حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول موضوعی (content) یعنی داخلی و کیفیاتی، جس میں اشعار یا خیالات اپنی اصلی صورت میں نہیں، بلکہ شاعر یا صناعت کے نقطہ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کئے جاتے ہیں۔ دوم معروضی (circumstantial) یعنی واقعاتی اور خارجی رنگ کی نظمیں، جن میں شاعر یا صناعت موضوع مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ اُس کی اصلی حالت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور صحیح نقل کرتا ہے۔

موضوعی اقسام صنف میں ڈیہی، ہالو، نازنیک، لونی، لے لڑی (مورد)، مڈا، زہیرک، داستان گشت وغیرہ آجاتے ہیں۔ نیز اس میں تمام تصوفانہ اصناف سخن، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے برعکس معروضی شاعری کی دو تحتانی تقسیم کی جاتی ہے۔ بیانہ اور ڈرامائی۔ بیانہ میں تمام دزمیہ اور رومانی داستانوں (epic) کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اور ڈرامائی میں "پیغورہ" خاصے کی چیز ہے۔ میر گہرام اور میر چاکر خاں دند سے منسوب متداول پیغورہ بلوچی زبان و ادب میں نہایت اعلیٰ اور پُر شکوہ ڈرامائی

شاعری کے نمونہ ہیں۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ ڈرامائی شاعری سے مراد یہ ہے کہ ایسی نظمیں جس میں کردار تو پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ایکٹنگ کے لئے ڈرامہ نہیں لکھا جاتا۔ نیز اس حقیقت کا اعتراف کر لینے میں کوئی مفاد فقہ نہیں کہ بلوچی شعری اور ہندوستانی شعری میں جس قدر ڈرامائی عنصر موجود ہیں، اس قدر دوسری پاکستانی زبانوں میں نہیں ہے۔

ملک اشعر، جامِ دُرک نے کن کن اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی، اس کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ عشقہ نظموں، چند ترقی نظموں اور کچھ امثالی اشعار زبانِ زہدِ خلافت میں اور ان میں سے کچھ نظم بند بھی کئے جاپہلے ہیں جن کی رباعی و کشتی، معنی آفرینی و اثر انگیزی کے پیش نظر اسی عظیم المرتبت شاعر کا درجہ بخوبی متعین کیا جاسکتا ہے۔

گر شد اوت حدتیاں یاراں | ترجمہ: "دوستو! سنو!!
جامِ دُرک کو شغفِ گفتار | جامِ دُرک کا کلام حدیث ہے"

یہ شعرا ان بات کی صاف غمازی کر رہا ہے کہ جامِ دُرک کو اپنی شاعرانہ صلاحیت اور اثر و نفوذ کا کما حقہ احساس تھا۔ اس شعر سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ اپنے عہد میں بھی وہ نامور تھا۔ اور اس کے ہم عصر شعراء اُسے تاجدارِ سخن تسلیم کرتے تھے۔ نیز جامِ دُرک یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی شاعری میں جو سوز و گداز، جو دردِ مندی، جو لطفِ بیان اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں۔ یہ نہ صرف جامِ دُرک کا اپنے متعلق احساس تھا، بلکہ بعد کے شعراء اور نقادانِ فن نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور بغیر تکلف اُس کی شیرینی گفتار میں رطب اللسان ہوئے ہیں۔ لہذا جامِ دُرک کے مذکورہ بالا شعر کو محض شاعرانہ تعلی نہیں، بلکہ معرفتِ نفس کی روشن مثال سمجھنا چاہیے۔ ایک جگہ وہ اپنی شاعری کے متعلق کہتا ہے۔

گلوں کو شغفت | ترجمہ: "میں نے سخن سرائی کی ہے
دردِ دل سپخت | میں نے موتی پروئے ہیں
لعلوں کو پخت | میں نے لعل سمیٹے ہیں؟"

واقعہ بھی یہی ہے۔ جامِ دُرک کے متداول کلام پر نگاہ باز گشت ڈالئے۔ اور اُس کے اندازِ بیان، ندرتِ خیال، اچھوتی تشبیہات، انوکھے استعارات، نوالے کٹائے کے ساتھ زبان و بیان کی پاکیزگی، اور الفاظ کے خوبصورت چناؤ، آہنگِ فنی کر دیکھئے تو آپ کو اس شاعرِ باکمال کا مذکورہ قول قطعی درست معلوم ہوگا۔ سچ یہاں پر یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جامِ دُرک ڈوبیکی تھا اور ڈوبیکیوں کی زبان فصاحت و بلاغت میں لاجواب مانی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ڈوبیکی گفتاراں مزنِ مزاں | ترجمہ: "ڈوبیکیوں کا کلام نہایت فصیح و بلیغ ہے۔
جہراش شہرِ شمشکویں شران | ان کا کلام سونے اور جواہر سے زیادہ قیمتی ہے"

اے دیکھئے میرا مقالہ "بلوچی ادب" ملاحظہ فرمائیے! انکا ذکر اچھی دس سالہ مئی ۱۹۵۷ء کے نفعی ترجمہ "دوستو! باتیں سنو، جامِ دُرک کا کلام سنو" میں ملے گا۔ لیکن ملک محمد نواز صاحب نے تن کے تزیین کو زیادہ موزوں قرار دیا کہ اے دیکھئے نادرِ سخن بلوچستان، سہ ماہی ۱۵، ترجمہ میں نے خود کیا ہے۔ یہ نہ تو زعم کا ترجمہ شعری فصیح تفہیم میں نظر آتا ہے۔

جام دُرک کے شاعرانہ کمالات کی ابتدا اُس دلی پر سوز سے ہوتی ہے جو عشق کے تیر کا گھائی ہو چکا ہے جس کا محبوب عبورِ حسن، خوبی پر نہ کے باوجود ایک ایسا تارہ اُمید ہے جس کی شعاعیں منعکس ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اُس کی بارگاہ میں محو کھڑا ہے لیکن وہ خود اپنے ہی جلوں میں کھویا ہوا ہے۔ اپنی ہی نظارگی میں مبتلا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ اس کی رعنائی و دلکشی بے خودی و آگہی، دارفتگی و شیفگی، روشنی و تابندگی ہزار پردوں میں پہاں رہنے کے باوجود ہر تاباں کی طرح چشم ہائے خلعت کے لئے خیر کن ہے۔ بشیر احمد صاحب رقمطراز ہیں۔

”محبوب کا سراپا بیان کرنے میں جام کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ شاعری کا ایک نیا انداز

جسے جام دُرک نے اختیار کر لیا تھا۔ بلوچی زبان و ادب کے لئے ایک نیا رشتہ تھا۔“

واقعہ یہ ہے کہ جام دُرک کی منہ ادل نظموں میں سے اکثر و بیشتر کی ابتداء محبوب کے سراپا سے ہوتی ہے۔ ان ابتدائیہ کو ہم سجا طور پر صنفِ قصیدہ کی اصطلاح میں ”تثیب“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سراپا کے بیان کے بعد ”گزر“ کی منزل آتی ہے۔ یہاں وہ سوزِ فراق، محبتِ شب کی جلی ہوئی شمع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ درِ ہجوری، نارِ سالی و شکیبائی کا بیان ایسے محسوس انداز میں کرتا ہے کہ دل کی دھڑکن غیر ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اور اُس کی ہر ادا اُس کے حافظے میں محفوظ ہے۔ اور جسے اپنے شاعرانہ کمالات اور اظہارِ بیان کی جادو بیانی سے حیاتِ جاوداں بخشا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں بڑا کامیاب ہوا ہے۔ بلا غلط فہمی ہے۔

ترجمہ:- کل شب میرا محبوب اور ماہِ کالِ دوستی بدش نظر آئے
میں نے ان دونوں کا مقابلہ کیا

میرے محبوب کے چہرے کی دنگ چاند سے بد بالاتھی
کیونکہ چاند کے چہرے پر دھبہ تھا۔“

دو شبی کج اور ماہ چاند دی

ہم کو فغی اوستا تنال

ماہ مہ کج و رنگ شر ترنت

کہ ماہ و خیار سے مں دفء

ایک جگہ اپنے محبوب کا یوں تعارف کرتا ہے۔

گوں بہت و سہر و زیورال

ابروا ز کشیت چھو کال

رک بارگ انت چھو کا خداں

خداں پر سلطانیں پراں

ریچی آل جو اوجہ ہراں

شععی بر کلیت شعواں

من ایل و تار یکیں شیاں

ترجمہ:- منوے چاندی کے زیوروں کے ساتھ
تیرے ابرو گمان کی طرح کھنچے ہوئے ہیں
تیرے ہونٹ کاغذ کی مانند بار یک ہیں
تیری ہنسی سلطانوں سے مائل ہے

رات اور تاریک رات میں

جب آئینہ جو تیرے بکھیرتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے

گویا تاریک رات میں شمع ٹوٹے ہوئے ہے۔

سازِ سخن کی نہرا آواز میں شعرو سخن کا صحیح مذاق اور ذوقِ سلیم رکھنے والے حضرات پس سناؤ اُس پیکرِ محبوبی کی دلکش تصویر کو دیکھ لیتے ہیں۔ جو کبک درری کی طرح خوابیدہ فتنے جگاتا تھا کسی را بگندہ سے خراماں خراماں، اپنے ہی سخن کے جلووں میں کھویا کھویا، سانپ کی طرح لہراتا اور غرائلِ وحشی کی طرح چونکتا چلا جا رہا ہے۔ اور اُس کے نقشِ قدم کی برکت سے ذراتِ خاک آفتابِ ماہتاب کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ اور اُس منبعِ فیض اور مبداءِ حیات سے ہم آغوش ہو جانے کی تمنا میں حرکت و پرواز کے ذوق سے آشنا ہو کر مضطرب بے تاب ہیں۔ اور یہی وہ عبودیتِ محسنِ دُخوبی ہے۔ جس نے جامِ دُرک کی روح میں اتھنرا زپیدا کر دیا تھا اور وہ اپنے معاشرتی حدود و قیود سے بے نیاز اور دُنیا و مافیہا سے غافل اس پیکرِ حسن و خوبی پر جان و دل تیار کر چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی بلوغیت کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ غالب کا خیال ہے کہ عشق دہر زنی یکجا نہیں ہو سکتی۔ استاذی حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں:-

”عشق و خود پرستی دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ عشق کی تعریف یہ ہے کہ اولہا قتل و آخرہا حرق، یعنی اس کی ابتدا قتلِ نفس ہے اور انتہا تمام خواہشات اور ہوا و ہوس کا فنا، یہاں سب سے بڑی معصیت اپنے وجود کا حسن اور اثبات ہے۔ وجودِ ذنب لا یتقاس بہ ذنب (محبت کا اصلی مقام وہ ہے جہاں پہنچ کر نفس اپنے کو فنا کر دیتا ہے) اور پھر دستِ محبوب میں محض ایک آلہ بے روح بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا دل اس کے پہلو میں نہیں ہوتا بلکہ محبوب کی انگلیوں میں، یقلبھا کیفِ یثناؤ (جس طرح چاہتا ہے پھرتا ہے) محبت کا استغراق خود اس کو محبوب کے صفات و فغائل کا ایک دوسرا پیکر بنا دیتا ہے۔ وہ خود دیکھتا ہے تو اُسی نظر سے، اور سنتا ہے تو اُسی کے کانوں سے، خود اس کی کوئی خواہش نہیں، اور محبوب کی مرضی اس کی مرضی بن جاتی ہے۔“

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

”رسم و راہ کو چھوڑ کر عشق کے واقف کار جانتے ہیں کہ یہاں حق و مہر کا سوال کام نہیں دیتا۔ بلکہ اس دُنیا کا سارا دار و مدار محض بخشش و کرم پر ہے۔ اُس کی نظریں جس پر پڑ جائیں اور اس کی بے نیازی جس کو سر فراز کر دے وہی سب سے زیادہ مستحق اور امی میں سب سے بڑا ہنر ہے۔ استحقاق اور مہر دکھا کر چاندی اور سونا لیا جاسکتا ہے۔ لیکن محبت کی نظریں اور پیار کی ادائیگی نہیں خریدی جاسکتیں اور سطور اگر لیلیٰ کے خیمے کا پردہ اٹھاتا اور قیس کی دیوانگی کے مقابلے میں اپنے فنِ منطق کو پیش کرتا تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا ہے۔“

محمودہ دے لے اگت ہست باز گوئی : کانیجا سخن بہ ملک فریدوں نمی دارو

۱۔ دیکھئے شمرید کہنے پُر لطف اور سادگی سے کہتا ہے: ”مہر پہ بہانہ لگتے۔“ بوجی شاعری میں یہ مصرع ضربِ المثل بن گیا ہے۔ لہذا قبیل
۲۔ ”ایک نظم و ملبوسہ بوجہ“ (کراچی) میں اس مصرع کو دہراتا نظر آتا ہے۔

عشق
فلسفہ
لئے
فی الحقیقہ
پڑ گئے

ان د
وہ فنا

سے

ایسا

ہے

اس

—

لے

کی

عشق خواہ کسی شکل میں ہو، محض دنیا کے لئے ہے، دلبری و رعنائی کے لئے نہیں ہے۔ یہ خواہ
محسن کے ہیں۔ اس کا کوئی جلوہ دلربائی و نظارہ پروردی سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر بے
مہری اور غیظ و غضب میں ہو جب بھی پیار کرنے ہی کی چیز ہوتی ہے۔ پھر لطف و نوازش اور بخشش و
کرم کی ہوشربائی کا کیا پوچھنا..... ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ شیعہ عشق و کمال شیفگی یہ ہے
کہ معشوق پر حکمرانی نہ کیجئے۔ بلکہ اپنے عشق کو اس کے فرمان عشق کا محکوم کر دیجئے۔ فلسفہ محسن و عشق
کے رب سے بڑے حکیم عونی شیرازی کا قول فیصل آپ کو معلوم ہے۔

قبول خاطر معشوق دیدار ست بحکم شوق تماشا کن کہ بے ادبی ست
آپ کو اگر دعویٰ محبت ہے تو ہر اس شے کو پیار کیجئے جس پر پیار کی ایک قسط انداز نظر ہی اس
نے ڈال دی۔ مذہب عشق کی منزل تفویض یہی ہے۔

عشق کا یہی وہ پاکیزہ تصور ہے۔ یہی وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جس پر جامِ دُرک ادا و خیر حیات میں غائر ہوا۔ اور یہی وہ
فلسفہ ہے جس سے حکمت بے خودی کے برگ و بار نو پذیر ہوئے۔ شکر نے چھوٹے اور اس کی خوشبو مشامِ جاں کے
لئے حیاتِ آخرین بنی۔ اور جسے صوفیاء کے جملہ مکاتیب و مذاہب پیش نظر رکھتے ہیں۔ عشق کی یہ کمال خود سپردگی، یہ فنا
فی المحبوب کی ادا، یہ بخون و شیفگی شیخ محمد اقبال کو خوش نہ آئی۔ لہذا اسے غیر حُر کی ادا قرار دیتے ہوئے "تخمینِ وطن" میں
پڑ گئے اور "تصورِ خودی" کی صورت گری فرمانے کی سعی ناشکر فرمائی۔

ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

ان دو پر لطف تصورِ عشق کے محسن و قبح سے قطع نظر جامِ دُرک کے یہاں عشق کا برز ایک انوکھے پہلو سے ہوتا ہے
وہ قناتی النہات کا قائل نہیں اور نہ بحرِ ذخا میں وجودِ ذرہ آب کی معنویت اور بعدِ آگاہی کا ہوا خواہ ہے۔ اس کے کلام
سے بدیہی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طالبِ مطلوب، محب و محبوب، عاشق و معشوق ایک ہی منبعِ انوار کی چھوٹی شعاعیں ہیں
ایسا جلوہ ہے جس میں تکرار نہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس طرح پٹے ہوئے ہیں۔ جیسے دن
سے رات۔ ملاحظہ فرمائیے۔ نظم مندرجہ ذیل مصرع سے شروع ہوتی ہے۔

بیا بیانا راں! من نہ ہیر میتخان

یعنی آؤ! میرے دوستو! میں نہ ہیر ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد محض دنیا و عشق کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۔ بوجی لفظ "ذہیر" وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مجرزدگی۔ اُداسی۔ تنہائی، اضطراب و بے قراری، خون و سودا کے عشقِ ابد و مجرزی
کی حملہ کیفیات و حالات کا ابراغ اس ایک لفظ سے کیا جاتا ہے۔

توے آف ماہی من تئی کٹہ داں
توے نیلین کنب من تئی تارواں
توے کوہ کاہن من تئی شکرہاں
توے زانگیں گوخ من تئی دھیراں

پھر ٹیپ کا بند آتا ہے۔

گو شدارت بیلاں جام عزارہاں
ایش دے ہیشنت من تئی وگشاں

اس کے بعد دوسرا بند شروع ہوتا ہے۔

توے چار دہی ماہ من تئی ماہ گواں
توے روج نیر دج، من روش گراں
توے کردغیں جگ، من گھوڑواں
توے ساخاں نیے من تئی چترال
توے پاداں شپا دے من تئی لتراں
توے سیاہیں بیہ کار، من جو گمان
مندراں جنان رمن دستت گراں

ترجمہ:- "تو مچھلی ہے، میں تیری مسمی ہوں
تو نیلی جھیل ہے، میں اُس میں تیرنے والا ہوں
تو پہاڑی کوتر ہے، میں شکرہ ہوں
تو دودھیل گائے ہے، میں تیرا دوسرے والا ہوں"

ترجمہ:- "دوستو! جام کی خرباد سن لو
یہ بھی وہی ہے، مگر میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں"

ترجمہ:- "تو چودھویں کا چاند ہے اور میں چاند گرہن ہوں
تو ہر نیمروز ہے اور میں سورج گرہن ہوں
تو اونٹوں کا ایک بکھرا گڈ ہے اور میں اسے جمع کرنے والا
گھوڑ سوار
تو جب زمین پر استراحت فرما ہوتی ہے تو میں تیرے نیچے
چٹائی کی طرح بچھ جاتا ہوں
تو جب پیادہ پانکلتی ہے تو میں تیرے پاؤں کا پیرا ہوتا ہوں
تو سیاہ ناگن ہے اور میں جوگی ہوں

اور اس لئے دم کہہ رہا ہوں کہ تجھے اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں!"

یہ خوبصورت نظم بڑی طویل ہے۔ جام اسی طرح من و تو کا تقابل کرتا چلا گیا ہے۔ کاش! اس نظم کے بکھرے ہوئے بند مرتب و مدون ہو جائیں اور حسن و زیبائی کا وہ پیکر حقیقی نظر آ سکے جس کی جھلکیاں مذکورہ بند میں پائی جاتی ہیں اور جس پر جام

سہ بشیر احمد صاحب نے اپنے مضمون "جام درگ" و مطبوعہ رسالہ اولس کوئٹہ شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۶۲ء میں "توے چار دہی ماہ من ماہ و گپ" نقی کیا ہے جو نقی سماعت کا تغیر معلوم ہوتا ہے اور صرف غلط ہے۔ مقام حیرت ہے کہ اہل زبان ایسی فاش غلطی کا مرتکب ہوا اور التزام قوائی نظر انداز کرتے ہوئے بے معنی ٹکڑا جوڑ دیا جو الجھان کے اعتبار سے بھی ناقص ہے۔

سہ بشیر صاحب نے "من ایرنواں" لکھا ہے۔ یعنی میں دھنتی شام ہوں۔ لیکن مری علاقہ سے موصوہ متن میں "من درش گراں" ہی ہے۔

سہ ٹاکاں یعنی مٹی کو مری قبیلے کے لوگ "ساخاں" بولتے ہیں۔

سہ شہ صاحب نے "جو گمان" لکھا ہے۔ لیکن "من جو گمان" مراد ہے اور فصیح ہے۔

دل و جاں سے فدائی نہ تھا، بلکہ حسن کی بارگاہ میں محو کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں

حسن و عشق کی کشاکش اور کیفیت جذب و گریز کی نیرنگیاں کا سردانہ احساس تو کچھ دی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس دادی رنگ و بو میں کبھی بھولے بھٹکے قدم رکھا ہے اور اس حلیم زار کی حقیقت و ماہیت کے محض مشاہد نہیں، بلکہ خود بھی ایک حصہ بن گئے ہیں۔ عشق مجازی ہو یا حقیقی، حسن آلودہ پیر ہن خاکی ہو یا مطلق — عشق عشق ہے، اور عشق کی فطرت سے بعید ہے کہ اس میں مجبور ہو۔ عشق سوکت ہے، سراپا نہیں ہے۔ اضطراب ہے، ارتعاش ہے، استہزاز ہے، عاشق اور قرار دو متضاد باتیں ہیں۔ سعدی نے کتنی سچی بات فرمادی ہے :

اگرچہ عاشق صابر بود مگر سنگ است : ز عشق تائبہ صبری نہ از فرسنگ است

جام بھی عاشق تھا۔ اُس نے اپنے عشق کا اعلان بر سرِ رزم کیا، اور بر سرِ دار بھی تجدید کلمۃ الفت کرتا رہا۔ اس نے محبوب کا قصیدہ بر ملا کہا اور خوب کہا۔ اُس کی عشقیہ شاعری دنیائے ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور اس کا سوز و گداز پھر دل کو بھی موم کی طرح پگھلا دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ عاشق تھا اور عاشق کو صبر و قرار کہاں؟ ڈپانے دل کی حالت بیان کرتا ہے :-

ترجمہ :- یہ چاند جیسے خوبصورت بچے کی مانند جذب کرتا ہے

یہ ایک خوفناک شرک کی طرح زور کرتا ہے

یہ انہیں میں سے ہے جو سب میں ایک ہوتا ہے !

گر کنت تنگ و درد شمنی بچے

زور و کنت شاہ و ظالمیں ترکی

اش ہوا نہاں کہ مر صدائیکے

تشبیہ و استعارے کی دل کشی اور زبان اور پیرایہ بیان کی چاشنی سے قطع نظر یہ بقراری دل خواجہ میر درد کی یاد تازہ کر دیتی ہے :-

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے : ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

پھر جب اُمید کی کرن پیدا ہوتی ہے تو ایک عاشق کے دل کی کتنی سچی تصویر کھینچتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہئے کہ بجلی کا چمکنا، امید کا استعارہ ہے اور بادل مجاز مرسل۔ بادل بقراری اور بھلے کا مظہر ہوتا ہے۔ اور امید کی روشنی کے ساتھ بادل کی تاریکی پر لطف ہے اور مرآۃ النظیر کا مزہ پیدا کرتی ہے۔ ان معروضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملاحظہ فرمائیے :-

ترجمہ :- کل شب جو بجلی لہراتی ہوئی ادھر آئی

ایک غمور گھوڑی کی طرح لڑکھاتی ہوئی

وہ میرے محبوب کی خبر لائی

اور داماں مراد کو بھولوں سے بھر دیا

اتنگاں کندان و گردک دوشی

کیہوی و جلیگہ و پاہ و

ننگ دستان و دانگت مار و

ماگی و گنا شستو ہو جان و

لہراتی ہوئی برق تپاں جام کی پیامبری کرتی ہے۔ اردو اور فارسی شعرا نے بادِ صبا اور نہکت بادِ نسیم کو اپنا قاصد بنایا ہے۔ اور طرح طرح کے مضمون پیدا کئے ہیں۔ خود بلوچی شاعری میں نامہ بُری کے لئے کبوتر کی منت اُٹھانی جاتی رہی ہے۔ لیکن جام کو لہراتی برق اُس کے محبوب کا پیغام پہنچاتی ہے۔ یہ بخوبی، یہ حسن، یہ دلکشی، یہ انداز کسی دوسرے بلوچی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔

فارسی اور اردو شعرا بادِ صبا، نہکت نسیم، بادِ بہاری، کو اپنا قاصد و ہم راز بنا کر بھیجتے ہیں۔ بلوچی شاعری میں نامہ بُری کے لئے کبوتر کو تجویز کیا گیا ہے۔ مثلاً ملاح فاضل کہتا ہے۔

کچھت چاہی منہ کچھت ہزار کار	ترجمہ: اے کبوتر! مجھے تیرے ساتھ بہت کام ہے
فہوں بازات خیالوں میتگوں بار	مجھ پر غم بہت ہے اور خیالات کا دل پر بوجھ ہے
دیباں درو تال ادمرغ گوشدار	میں تجھے پیام دیتا ہوں
منی پنت و نصیحتاں دل و دار	اے پرندے! سن لے اور میرے پند و نصائح یاد رکھ!

لے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ آخری ایام جام درک نہ کر سکیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ شاعر جو دربار اور ڈھاڈر کے بازاروں اور جندب شہری عورتوں کا سراپا لکھتا تھا بھرا نشینی کے بعد مناظرِ فطرت اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی ہی کرتا نظر نہیں آتا بلکہ وہ انہیں ذی روح بھی تصور کر لیتا ہے۔ اور وہی اب اس کے ہم جلس، راز دان، محرمِ عشق، ماضیِ شفق، ہمدِ غم، غمگسٹ سب کچھ ہیں۔ جام کے یہاں مظاہرِ فطرت کا ذکر اس انداز میں نہیں پایا جاتا کہ محض جامد و ساکن ہے روح تصویر ہو، بلکہ وہ زندہ، متحرک، احساس اور جذبات سے معمور ہیں۔ اس لحاظ سے بھی جام کا پایہ نہایت بلند ہے۔ اتنی اعلیٰ درجہ کی خیال شاعری، بلوچی تو کیکہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اگر نثری زبان کا خیال شاعر در دُر در تھکے یہاں بھی گنتی کی چند نظموں سے ایسی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔ اردو شاعری تو اس لحاظ سے صفر ہے۔ فارسی شاعری میں رودکی کے ایک قصیدے کی تشبیب اور قافی کے چند بہاریہ قصائد قابلِ ذکر ہیں (دک) ۱۱ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ یہ محض شاعری نہیں۔ کبوتروں کے ذریعہ نامہ و پیام بھیجنے کی محققانہ ابتدا انہیں خلفاء و عباسیہ کے عہد میں نظر آتی ہے۔ دستاویزی طور پر اس کا ثبوت موجود ہے کہ بابک کی اسیری کی اطلاع معتمد بائد کو کبوتر کے ذریعہ بھیجی گئی تھی۔ کبوتر کے ذریعہ پیغام رسانی کا سلسلہ ملکوں کے فتح و فتح بعد از تک باضابطہ جاری رہا۔ پھر مصر کے عہدِ عباسی میں بھی اس نظام پیغام رسانی کا سراغ ملتا ہے۔ جنہوں نے اس فن کو کمال تک پہنچایا قاضی کے پاس قلعہ جل کے مقام پر خاص مینار بنائے گئے جہاں نامہ و کبوتر ترستے تھے۔ اور اس کی حیثیت نامہ بُری کے مرکز کی تھی۔ دود مقامات کو پیغام رسانی کے لئے مختلف منزلوں پر اس کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ایک کبوتر ایک منزل سے دوسری منزل تک اڑا کر اتنا تھا۔ وہاں اس کی گردن کے گرد پٹے ہوئے نامے کو اس کام کے لئے معین لوگ کھول کر دوسرے کبوتر کے پیڑ کو دیتے تھے۔ اسی طرح منزل منزل تبدیلی کے بعد نامہ اُس مقام تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ جہاں کا پتہ درج ہوا کرتا تھا۔ مفید عہد میں شہنشاہ جہانگیر نے کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کے اس نظام کا کامیاب تجربہ کیا۔ لیکن جب اس سے زیادہ کامیاب آسان اور قابلِ اطمینان ذریعہ صنعتی انقلاب کے عہد میں نظر ہوا تو اسے انحطاط کا سامنا کرنا پڑا جس کی ایک غلط فہمی شکل کبوتر بازی کے غیر مفید شغل میں تاحموز باقی ہے۔

مولا قاسم کہتا ہے :-

کاسگانی کنیاں کپوت آپ کن
گوں وتی نقشیں بانزلاں بال کن
گوں منی درست گال ادا حوال کن

ترجمہ :- اے کبوتر! تو کاسگانی کنب سے پانی لے
اور اپنے منقش پروں کے ذریعے اڑ جا
وہاں پہنچ کر، سیرے درست کے ساتھ تبادلہ خیال کر

یہ تو میدہا سادا انداز بیان اور اسلوبِ پریم رسانی ہوا۔ لیکن شاعران صاحبِ دل نے کبوتر کو تلمیح اور استعارے
کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ اور کبھی اپنے دل "اور دم" کو اور کبھی اپنے محبوب کو کبوتر قرار دے کر اُسے پیام دیا ہے۔
شہرید اپنی محبوبہ حانی جان کو کبوتر فرما کر کہتا ہے :-

منکئی در بندیں کپوت فریاد کن
نالگ اوزنگ و گوں منی بالادمن
اندر او چیری چاکر کا مارے جھک
سریر پوشت گھگھاریں دکننت

ترجمہ :- "قفص میں بند کبوتر! یعنی حانی، فریاد نہ کر
اپنی آہ و فغاں سے مجھے یقین دہانہ نہ کر
چاکر نے مجھے درپردہ خنجر مارا ہے
اور بظاہر میرا زخم دکھ رہا ہے"

اور حانی جواب دیتی ہے :-

دوشی کپوتاں نالنگ
و امیں دیش آگہ کنگ
شاہ بر خیال لال گشتگوں

ترجمہ :- رات کبوتر آہ و زاری کرتا رہا
دکھ کی آہ و زاری نے سوئے ہوئے دل کو جگایا
اور اب شہرید کے خیال میں مستغرق ہوں

حانی نے دوشی کپوتاں نالنگ میں کس کبوتر کا ذکر کیا ہے؟ یہ اہل سخن خوب جانتے ہیں۔ کیا واقعی پیام محبوب لے کر
رات کے وقت کبوتر آیا تھا؟ نہیں نہیں، یہ تو خود حانی کا اپنا دل تھا جو یکایک بھرا ہوا۔ درد چھک اٹھا اور وہ اپنے سنگیتر
بھائی کی یاد میں کھو گئی۔ یہاں کبوتر "دل" کا استعارہ نہیں تو کیا ہے۔ تلمیح و استعارے کی خوبی و رنگینی سے قطع نظر شہرید نے
پیام آشفٹہ سراں کبوتر کی معرفت بڑی خوبی سے سمجھوایا ہے۔ مثلاً :-

نندے مان نہای کا پر
کو کو کن احوال پر سے

ترجمہ :- نہایتی عمل میں جا کر بیٹھ جانا
اور خسر غوں غسٹ غوں کرتے ہوئے احوال کہنا

اس شعر میں کبوتر تلمیح و استعارہ کے طور پر نہیں استعمال کیا گیا۔ بلکہ واقعی معرفت پرندہ کی تصویر بنتی ہے۔ مولا رحیم کی ایک
منظم ملاحظہ فرمائیے :-

بیا کپوت اشتاپی چیدا بان کن

"اے کبوتر! یہاں آیا، اور جلدی یہاں سے پرواز کر!"

۱۔ ایک چٹیر شیریں کا نام ۲۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ میں درد سے کراہ رہا ہوں۔ حالانکہ یہ چاکر کی ضرب کا نتیجہ ہے۔ یعنی خراقِ حانی!

نے کہ داب کن نے کہ آرام کن
کنڈگ دیکھ ہاں چتر سر مال کن
دیم پراہ اویں "نزدک" تاب کن
مٹی کی گندہ کل ز دور وچ چار کن
باز لال نریکا گرو دار کن
نور و پیر من قاعدی طرز سے
پاکوت نند کہ من کین عارفہ

اس تمہید کے بعد کہتا ہے۔

گیشتر پیراجی بانکیں کا ڈو
شش و نہرنگ و جنتی لا ڈو
تو گیشتر بے جلیں پری وندو
نند نریکا وودت و زیار کن
منی سلامتی کا گد و سر کن
نئی زہیراں دہترال و اینت
پردتی چمانی سر سے داریت
آمنی پیش نوبتا ماریت

نہ تجھے راز میں سونا چاہئے نہ آرام دکرنا چاہئے
سلسلہ ہائے کوہ کے نشیب فرار سے پرواز کرتا ہوا
میری محبوبہ کی طرف روانہ ہو جا!
میر گل اندام محبوبہ کے مکان کا دور سے جائزہ لے کر آتا جا!
اور نزدیکی پہنچ کر اپنے پیروں کو سمیٹ سے (یعنی)
میری خاطر توقا مند کہ انداز میں (اُس کے پاس) جا!
کیونکہ آجائے تاکہ میں تجھے کچھ کہوں!

ترجمہ: "زیادہ تر انہی شہزادی کے لئے
جو ہر ماہ کی طرح تائید ہے
اُس پر صبر سے کہ
(اور) نزدیکی بچھ کر دردت "کر
داور) میری سلامتی کا نامہ پہنچا دے
وہ جب میرا دفتر فرقت پڑھ لے گی
اُسے اپنی آنکھوں سے لگائے گی
اور گزری ہوئی گھڑیوں کو یاد دے گی"

لیکن جام و رک کے پاس لہراتی ہوئی بجلی پیام محبوب لے کر آتی ہے۔ اُن کا نام بادل اُن کے دل حوالا زدہ کو اُمید و بیم کی
کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ "بادل" اُس کے داخلی و خارجی پیکر اور اضطرابِ بے قراری کی دوسری تیش بن جاتا
ہے۔ وہ شعاعِ اُمید جو قوسِ قزح کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور پھر اُمید و بیم کی ایک ایسی پُر کیفیت پیدا ہوتی
ہے جو دل کو تذبذب و تشکیک کے فکدہ کا شکار کر دیتی ہے۔ اُمید و محبوب کا نہ یقین ہوتا ہے اور نہ بے یقینی لذت
انظار سے دنگش ہونے دیتی ہے۔

"جنوب میں قوس قزح تن گئی
اُن کے قریب قمری رنگ کے طوفانی بادل منڈلے ہیں

رستہ یک درینے شہر دکن پر پارے
پر گزرو استین مجرنگیں

۱۔ "دعوت" ایک طریقہ سلام و التجار و احترام جو عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں عورتیں اپنے ہاتھ کو کپڑے میں لپیٹ لیتی
ہیں اور قمری عزیز خصوصاً بزرگ اُسے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ دکن یعنی جنوب

درست منی درست برہند و گون انت
من گون خاں کہ گول دِل و جھیراں
دِل گون خیں کہ گول منی و جھیری

اُس کا تمام خلق و شائستگی میرے محبوب کی طرح ہے
میں ہوں دیوانہ جھگڑتا دل سے ہوں
دل ہے دیوانہ اُبھکتا مجھ سے ہے

اور کبھی جام دُرک کسی رازِ دہاں کو تریب نہ پا کر اپنی "موری" دِھام کی گھوڑی کا نام اسے بھلا کر ہوتا ہے۔ اُسے دل کی حالت بیان کرتا ہے۔ "موری" زبانِ حال سے اپنے مالک کے دل کو تسلی دیتی ہے اور اپنی تمام قربت و فدا کو بروئے کار لا کر اُسے منزلِ مقصود پر پہنچا دینے کے عزم کا اظہار کرتی ہے۔

دِواہ بُرتہ بُری و رُو خین و
ژنگ کنت موری زامری و مُب و
جنت اُبر سر زاناں ملو کین و
اور منی دایہ سینگ و مسکانی
ماں تئی پاگ و مسک خراسانی
قادر تئی ساہ و رانگہ داندی
من ترا بیگاہی براں اود و
اودا من میری ڈیر و دِیا

ہیز رفتار تیری (مراد گھوڑی) جو صورتِ حال سے آگاہ
اپنی گھنی دُم کو مور کے مانند پھیلائے ہوئے
اپنا سراپے خوبصورت زانو سے ملا کر
دیوں مخاطب ہوتی ہے "اے میرے آقا!

تیری پگڑی رسد، خراسانی مشک میں سی رہے
راور، قادرِ مطلق تیری جان کا محافظ و نگہبان ہو
تو غم نہ کر، میں تجھے شباشب وہاں پہنچا دوں گی
وہاں — (یعنی) میری ڈیر سے کے سامنے ہے۔
اور پھر جب وہ اپنے محبوب کے آستانے پر پہنچتا ہے تو اس کا جی بھرتا ہے۔ لوگ باگ کے سامنے خود کو قابو میں رکھتے ہیں لیکن جب تنہائی نصیب ہوتی ہے تو انکھوں سے دلِ غول شدہ بہر نکلتا ہے۔ وہ دِل کو تسلی دیتا ہے کہ اے دل اُس کے خیال میں اتنا نہ محو ہو جا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

انکس لال و دیتال
انکس و دیری میں بناں
من و دیتغور گر تیگ دل و
گر تیگ دل و تابانگو و
دل گول خیال لال گول مکف
پر سجن بر تہیں غماں

"میں نے آستانہِ محبوب کی طرف دیکھا
اس کے آستانے اور قیام گاہ کو
دِچانچہ، میں دیکھتا رہا (اور) دل روتا رہا
دل روتا رہا — طلوعِ سحر تک!
میں نے دل سے کہا "اے دل! ساجن کے دگلہ از غموں میں
اس قدر نہ کھو جا!"

اے مور ایک پھولدار جھاری کو کہتے ہیں۔ موری کے معنی ہوئے مور جیسی اے زامری دُم سے میری سے مراد آستانہِ محبوب جو قلعہ میری میں کہیں
واقعہ ہوگا واضح رہے کہ اس زمانہ قلعہ کی تفصیل کے اندر ہزاروں خاندان آباد رہا کرتے تھے یہ قلعہ ہے کہ میری سے مراد شاہی محل ہے اے اشار کا یہ زجر ملکِ مہنہ پناہ نہ کیا۔

اللہ اللہ کس قدر پاکیزہ جذبہ ہے۔ کس قدر مہذب انداز بیان ہے۔ بظاہر الفاظ بہت ہلکے پھلکے ہیں، لیکن اثرات ملتے
 دل پھٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ درد کی پہلی منزل درد اور کراہ ہوتی ہے۔ اور جب درد حد سے گزر جاتا ہے تو ایک
 ہنر بازی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک قسم کی ہم آہنگی اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر دل ظالم ترک بادشاہ کی
 صفت آزمائی نہیں کرتا، اور نہ حسین و جمیل بچے کی طرح ضد کرتا ہے۔ ایک خمیر سناٹا زندگی پر محیط ہو جاتا ہے، لیکن حب
 بانی نصیب ہوتی ہے تو یہ ظاہری امن برقرار نہیں رہتا اور چشم ہائے خویشکام کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ دل کو سمجھاتا
 ہے کہ اس قدر اس کے خیال میں مت محو ہو جا کہ لوگ طعنہ زنی کرنے لگیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ یہ پاس ادب، یہ لحاظ،
 حرمت حسن کا شعور، یہ ادب تو جامِ دُرک کے بعد اُدو کے ایک درویشِ فحش مگر شہنشاہِ عشق میر تقی میر کے یہاں ہی نظر
 آتا ہے۔

سرزدیم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوتی

کوسوں اس کے اُور گئے، پُر سجدہ ہر ہر گام کیا!

جامِ دُرک کو اظہارِ بیاں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ ماضی کے شعری سرمایہ سے پیرایہ اظہار لیتا ہے۔ اور اس میں قوتِ تخلیق
 اور آگینہ دل کا جو ہر اس طرح ملا دیتا ہے کہ جیسے سنتے ہی صبر و قرار ٹٹ جاتا ہے۔

گوشِ دارتِ حدیثاں یا راں : جامِ دُرک کو شتغیلِ گفتِ اداں

عجیب بات ہے کہ جامِ دُرک کا رشتہ ایک طرف بلوچی ادب کے قدیم سرمایہ سے بڑا مستحکم نظر آتا ہے تو دوسری جانب
 اس کا اثر مست تو کلی اور دورِ حاضر کے شعراء میں نظر آتا ہے۔ خصوصاً وہ شعراء جو اسکول و کالج کی تعلیم سے استفادہ کر
 سکے ہیں۔ لہذا اس کے کلام کو سمجھنے اور اس کی تعلیم کے لئے ایک طرف ہمیں قدما کی شاعری پر نظر ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے
 تو دوسری جانب اس کے اثرات معلوم کرنے کے لئے مست تو کلی کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر جامِ دُرک کے
 شاعرانہ کمالات کا بہرہ لگایا جاسکتا۔

جامِ دُرک سے پہلے شاعری کی فضا زیادہ تر معروضی رنگ لئے ہوئے ہے۔ داخلی جذبات و کیفیات کے بیان میں
 بھی خارجیت کا عمل دخل ہے۔ نیز تشبیہات و استعارات اور مجاز مرسل و ایمائیت کے بجائے مدعا کے دل سادہ بیانِ تہذیب
 میں بیان کیا جاتا ہے۔ معاملہ دل اسجاز و اختصار سے بیان کرنے کے بجائے پوری داستانِ بیان کو ناوقت کا رواج تھا۔ وہ
 تعلیم اور سہل ممتنع نظر نہیں آتا جو جامِ دُرک کے ایوانِ شاعری کو زیرِ زمینیت بخشا ہے۔ شہریدہ رسم و راہِ عاشقی میں جامِ دُرک
 اور مست تو کلی سے کم نہ تھا۔ اس نے بھی نفسِ معصوم کے حصول کے لئے رُپ رُپ کر ایامِ حیات گزارے۔ صحرا چھرا چھرا ہے جلا وطنی

۱۔ "حالی شہریدہ" از کامل القادری مطبوعہ بولان گورنمنٹ پریس، کوئٹہ ۱۹۵۲ء، قدرے تبدیلی کے بعد یہ مضمون دی یونیورسٹی، گلگتہ ۱۹۵۴ء، انگریزی روزنامہ
 "دی ٹائمز آف کراچی" ۱۹۵۵ء اور پھر انگریزی روزنامہ "دی موزنگ نیوز" کراچی اور ڈھاکہ میں شائع ہوا۔ اس قدر پسندیدہ اور معروف مضمون کو رسالہ "مغربی پاکستان"
 گلگتہ اطلاعات مغربی پاکستان لاہور کے شمارہ جولائی ۱۹۶۱ء میں کمالیہ شاعرانہ خیال نے من و عنان سے شائع کر لیا ہے صریح دلائل و دلائل دد سے کہ کف جوارخ دارد!

اور غربت کے دن دیکھے ہیں۔ مجاز سے حقیقت تک کی منزلیں طے کی ہیں۔ ذرا اسلوب بیان ملاحظہ فرمائیے۔

”اے حانی! تجھے (میرے) شہر کے سر کی قسم!

تو مجھ سے اپنے چہرے کو گھر لگھٹ میں نہ چسپا
مجھے نیم لنگھی سے نہ دیکھ

دل کوئی ایسی چیز نہیں جسے قبضے میں رکھنے کیلئے رسی ڈالی جائے
محبت دولت سے نہیں خریدی جاسکتی“

حانی ترا شاہ بر سر انت

اچ ماسری د جھنڈ مکن

مارا پر نیم چھی مچار

دل کوئی چی بر نہ انت

مہر پر بہا گپتہ نہ بیت

شہرید کالب دلہجہ نہایت ہندب اور شگفتہ ہے۔ وہ گوردرج فن شاعری سے استفادہ کرتا ہے اور ایجاز کے ساتھ مدعا بیان کرنے کے بجائے ہر بات کھول کھول کر افسانہ خوانی کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ لیکن جب حرف مطلب پر پہنچتا ہے تو زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ذیل کی نظم میں نہ وہ شب بھراں کا دکھڑا دلتا ہے اور ان مصائب و معائب کو بیان کرتا ہے جو اسے فرقت یار سے پہنچ رہا ہے۔ پس اس قدر قاصد کو کہتا ہے کہ۔

”تو شہرید کا راز داد ہے!“

صرف یہ جان لینا کافی ہو گا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عشق و محسن کے معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں یہاں زور بیان اور طویل خطابت کے بجائے چھکی ہوئی نگاہیں، کپکپاتے ہوئے لب اور ایک آہ سرد، صورت حال کا اظہار کے لئے کافی ہوتی ہے۔ طویل کلام سے اسے کیا نسبت! اسے

اے کمال سخن کے دیوانے! : مادرئے سخن بھی ہے اک بات!

شہرید کے نامہ شوق کا آغاز ملاحظہ ہو:-

کہنی کپوت در لاکھیں

شہرچم و شیشا ربا نہ لیں

چے نشنگ و چینکا چنے؟

زہا بہارانی چنے!

”اے خوش بیان سبز کبوتر!

اے سُرخ آنکھوں اور شیشا سے باز دُل والے کبوتر!

کیوں بیجا دانہ چُک رہا ہے

میری محبوبہ کے پاس چلا جا!“

پھر اپنے دوست کی جائے رہائش کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور اُس کے بعد خود حدیث یار زبان پر آتی ہے۔ لیکن وہ اپنے دل کی بھڑاس کبوتر کو مخاطب کر کے نکال لیتا ہے۔ اور جب اصل پیام دینے کی نوبت پہنچتی ہے تو وہ صرف یہ پیام دیتا ہے۔

”اے شیشا“ ایک درخت کا نام۔ مراد خوبصورت مڈول، گول گول بھرے بازو دُل والا کبوتر۔ نیز مضبوط اور توانا کا مفہوم بھی مترشح ہوتا ہے۔ یہی الفاظ کے استعمال کی خوبی اور بوجی شاعری کا امتیازی پہلو ہے!

ایش انت منی دوست بر نشان
بال کن و سرزان بر بند
گو انگ جنت پر جیڑی ہمسراں
مرگے من رگیتہ اد جاناں!
مرگے نیماں من در حدیث
شاہ ایں مرید بر مھرماں

”یہ ہی میری محبوبہ کی نشانیاں
اس کے زانو پر جا کر بیٹھ جانا
وہ آواز دے گی
اے میری سہیلیہ! آؤ!
میں نے ایک پرندہ پکڑ لیا ہے
تو اُسے، تبا دینا کہ میں پرندہ نہیں ہوں
دیکھ، شہ مرید کا ہم راز ہوں“

حانی کے متعلق محقق نہیں کہ وہ شاعرہ تھی۔ بہر کیف اُس سے بہت سی نظمیں منسوب کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

در شئی سرنی سنگین ات
بُز پہ چاکری ماڑی ء
اود امن سری بادگیری ء
گو نشان گشتگ بیگاہی
نوداں شترنگ بانگواہی
دروں مسیت انت گوں لوان
منہانی سری گوں بیگان

”میں رات چاکر کے محل میں
پہلی منزل پر سوئی ہوئی تھی
رات بھر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی
بادل صبح تک برستے رہے
میرے زلیور بمعہ عطریات
میری ”منہانی سری“ وغیرہ
سب بھیگ گئے!“

اس کے بعد حانی بادلوں سے مخاطب ہو کر نہایت پُر شوق انداز سے کہتی ہے۔

نوداں گوں شہامت انت
بل ات گوراکاں زمیناں
گورائے زرعہ سوزیناں
گو ارات مکہ بر در بند ء
اندو شہ مرید دتنگ انت

”دیں بادلوں سے کہنے لگی،
”اے بادلو! تم سے برکت التجا کرتی ہوں
کہ یہاں اپنی سچو ہاری بند کر دو
نیلے سمندر پر سے برستی ہوئی
مکہ شریف کی پیش گاہ تک جاؤ، اور وہاں برسو
جہاں شہ مرید سویا ہوا ہے!“

اس کے بعد حانی دل حرمیں نصیب کی حکایت نثرانی حجاب و کما اب حیا کے ساتھ بیان کرتی ہے۔
”دل کو دو نیم کرنے والی اُداسی نہیں چھوڑتی
دل بُری زہیر دل نیلنت

کپڑوں ترانگان شاہِ بگلان
ارس اور گل گانت من چان
چو بشاری نگورتی ہوران
گوارنت و نہ بُرت یسج بُر

شہ مرید کی یاد میں پڑی ہوئی ہوں
میری آنکھیں آنسوؤں سے بھریں ڈھیلے ہوتی ہیں
جیسے سادہ کی وہ گھٹا
جو برسے کے باوجود نہیں کھلتی!

شہ مرید حانی، بی برگ، عزت پنجگوری، مست تو کی اور جامِ دُرک میں سے ہر ایک اپنے اپنے انداز میں نابرداری
عشق پیش کرتے ہیں۔ شہ مرید اور حانی کا انداز بیان سادہ اور حقیقت نگاری کے لیے میں عناصر سے ترکیب پاتے ہیں داخلی
کیفیات کے اظہار کے لئے خارجی مظاہر کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن خارجییت اور داخلییت کا اس قدر لطیف امتزاج ان
کی شاعری میں پیدا ہو گیا ہے کہ اثر آفرینی اور نفوذ پذیری میں نہ مرید کا رنگ بے مثل ہے۔ شہ مرید کے برعکس جامِ دُرک
کی عشقہ شاعری میں ایمانیت غالب ہے۔ اور بیانیہ پیرایہ بیان کے بجائے تعلیمِ اہل کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے
نیز استعارہ و کنایہ اور تشبیہ و مجاز مرسل کے شاعرانہ کمالات کے ساتھ ساتھ خونیں دل کی حکایت خوشحال کچھ ایسے
انداز میں چھڑی گئی ہے اور تقسیمِ دہن کے زخموں کی نمائش کچھ ایسے انداز میں کی گئی ہے کہ انہیں سن کر دل ہائی بے آب
کی طرح تر پنے لگتا ہے۔ شہ مرید اور حانی کے کلام میں سادگی و پُرکاری ہے اور جذبات و احساسات ایک پُر سکون چشمے
کی طرح بہتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس جامِ دُرک کے یہاں ایک موجِ دریا کی روانی، تلاطم، صبور، گرداب، شور، ہچل
اور بے تابی پائی جاتی ہے۔

جامِ دُرک اور بی برگ کی عشقہ شاعری میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بی برگ بخت اور عاشق تھا۔
اُسے شبِ فرقت کی گھڑیاں نصیب نہ ہوئیں۔ اُس نے عشق کیا اور گھر مقصود کے حصول میں کامیاب رہا۔ لہذا اس کے
یہاں رجائیت اور ماحو و دسی کی رنگین معاشرہ بندی مٹی ہے، نیردہ عشق سے کہیں زیادہ اپنی سپاہیانہ روش پر فخر کرتا ہے۔
اس کی شاعری، ہم جوئی، بہادری، مشکلات و مصائب میں گھر جانے کے احساسات سے معمور نظر آتی ہے۔ یہی ہم جوئی
اور فتح مندی ہے جو اُسے عشق کے اس بلند مقام تک پہنچنے میں دامن کشاں رہی۔ لہذا اس کی شاعری، رجائیت،
ہم جوئی، شوخی، معاشرہ بندی کی خصوصیت کی حامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

من کہ مالِ بیستان و جنال شیراں
مالِ مغل کاری گشتگیں کیناں
تپِ رسعت ترکیں جن شہی پارساں

یہ اشعار میں بیستان سے بھیج رہا ہوں
میں مغلوں کی قید میں پڑا ہوا ہوں
ترک عورتیں جن کی پی ٹونے کی ہوتی ہے

اے راقم السطور نے گزشتہ صفحات میں شہ مرید اور حانی سے منسوب کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کے مغلقت قطعیت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ
وہ واقعی ان کے ہیں یا سو بھاؤ دم کی داستانِ حانی و شہ مرید کے اجزاء پریشاں۔ یہ تحقیق طلب مسئلہ ہے! (صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ ہو)

نیم چھے آزمانء دسینت جہاں
 تنگوں پٹی بُردِ بردانِ سنت
 ول ول بنت چو کبریٰ ماراں
 چو پتوڑیں مردماں ناداں
 گر یہ کشت شہ سجڑیں محلاں
 گنداں مے بالادء ملوکی
 آسنگ کشت پر آہے دشیں
 بی برگ تہی بالادء نصیب باتیں
 عرض کتہ دانثریء گوداے ہرماں
 یرس سنت شبہ آہ یسین پت و براساں
 اے چہ کہے کہ ماں شے باندیں؟
 نیم شہاں زکلیں زہار یا کٹی
 ماماں و اب و شاد ہاں نیلی
 بوج دہل باندیء بلورچ میگا
 چنیتوں سرشہ حاکی زلیاں
 زہل و زہریاں امراں
 انش نظر بنداں یاد شامیاں
 بو تگلک باند بوجء جہاتیء
 پاو چڑیا مینیت جٹ دیرانی
 دوست مہی ماڑیء سرس لال انت
 ہفتی ماڑیء سرء و ابیں
 رانثری مرد پر گندہ گنگ و شاماں
 من نیم شب و ترکی طبعے کشتاں
 ماں ملوکانی چچیں محلاں
 اکڑانء پر آسین میہاں
 دل گرانء چو کبریٰ ماراں

جب چلتی ہیں تو چکبرے سانپ کی طرح بل کھاتی نظر آتی ہیں
 انہیں جب میں دیکھتا ہوں
 تو زخمی شخص کی طرح کراہتا ہوں
 وہ عالی شان محل سے جہانک کر
 میرا خوشنما قد دیکھتی ہیں
 سرلی آواز میں سرگوشی کرتی ہیں
 "اے بی برگ!
 میں تیرے قد پر داری جاؤں"
 شہزادی نے اپنے عزیزوں سے کہا
 اور پھر اپنے بھائی اور باپ سے بھی پوچھا
 یہ قیدی کون ہے؟
 یہ کون ہے جو آدمی رات کے وقت دروناک فرما دیں کہ ہے
 اور ہمیں آرام سے سوتے نہیں دیتا
 اس بلورچ قیدی کو رہا کر دو!
 مجھے قید سے نجات مل گئی
 مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے بھی نجات ملی
 میری نظر بندی بھی ختم ہو گئی
 قید خانہ کے داروغہ نے مجھے رہا کر دیا
 میرا محل جیسا خوبصورت محبوب محل میں رہتا ہے
 وہ محل کی ساتویں منزل پر استراحت فرما ہے
 اچھے اچھے اُس کے دیدار کے محتج ہیں
 میں آدمی رات کے وقت محل میں داخل ہوا
 میں امیروں کے شاندار محل میں پہنچا
 بالائی منزل پر
 میوں کو پکڑ پکڑ کر چڑھنا شروع کیا
 چکبرے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا ادا پر گیا۔

نیں کہ ماڈی نیام گورہ کا یاں
جان منی شہی بر فراں بختہ
پتکے داتوں دل خیالوں را
گنہ نوا چند سے سر مڑا یاں
گوں چند نگ و بالاد ویرا سینے
نیں کہ ماڈی بر سر کاتکاں
منجی بانکتے کنت آگاہ
داس نہ پن داریں دب و گنتاں
چوڑ نہ گو مزی بار گیں سرین

جیسے ہی میں دریاں میں پہنچا
مجھ پر خوف طاری ہوا
اور میں نے اپنے دل کو سمجھایا
دیکھ، بزدل نہ بن!
بزدلی سے تیری جان کو خطرہ ہے
محل کے اوپر پہنچ کر
میں نے محل کی مالکہ کو بیدار کیا

کلاسیکل یا پند دھویں اور سولہویں صدی کی عشقیہ شاعری کی عام ہیج اور انداز بیان یہی ہے۔ وہ پوری داستان بیان کرتے ہیں اور خیالات نگاری کا جو ہر دکھاتے ہیں۔ اور یہ رچا ہوا انداز اٹھارہویں صدی کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتا ہے۔ مثلاً عزت چنگوری نا صوری عشق میں جو درد مند صدا میں بلند کی ہیں، اُس کی لئے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ عزت چنگوری کی زندگی کا ایسا یہ تھا کہ اُس کا محبوب فوت ہو جاتا ہے، اور وہ فراق یاں پر سوز صدا میں بلند کرنے لگتا ہے اور قریب قریب اُس کی تلاش میں مادامہاں پھر تلے لیکن تسکین قلب کا سامان نہیں ملتا۔

”میں نے خراسان کا سفر کیا
میں نے ہندوستان کی پُر آسائش زندگی دیکھی
میں یہودیوں کے ملک میں گیا
لیکن کہیں مجھے محبوب کی صورت نظر نہیں آئی“

من رفت گوں خراسان
ہندو کٹ و بویاں
سیل دانگوں یہوداں
فیت صورت گل اندام

پھر کہتا ہے:-

”پیر و ال سر بازہ کے علاوہ

سرباز شہر پیر و ال

۱۔ انجم قزلباش صاحب نے عزت چنگوری کی محبوبہ کا نام ”مہربانو“ قیاس کیا ہے۔ اس کی متبادل نظموں میں ”مہرک“ نظر آتا ہے جو بدیہی طور پر ”ماہ رخ“ کا مخفف ہے۔ ”ک“ کا تبادلہ حرف ”خ“ سے عام طور پر مشاہد ہے میں آتا ہے۔ تفصیلی مباحث کیلئے دیکھئے میرا مضمون ”دی لے آف پیردان“، مطبوعہ رسالہ مغربی پاکستان (انگریزی) دسمبر ۱۹۶۳ء لاہور۔ نیز انجم صاحب کا مضمون ”مطبوعہ امروز لاہور۔“

۲۔ متعلقہ ۵۵) ایک قسم کا زیور، جھومر کی قسم کا جو پیشانی پر باندھا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ رین کے طور پر رومال باندھا جاتا تھا۔ ۱۵۰ متعلقہ ۵۶) نہا، ”سما زاد، ماموں زاد، چھوٹی زاد بھائی اور دیگر قریبی مرد رشتہ دار کے لئے بولا جاتا ہے۔“

رفتوں تال امیراں
مگر گدائی پنڈاں
چو کاہلی فقیراں
ہر جا رواں نیراں
نیت انت دل و رادراں
دلبر اگہ نہ دیشک
کس چو مہرک نہ بونگ
ارمان پر ماہ پریء
بے عیب و دروریء
پادگوں ہما زریء
من مہرک نہ گسنداں
باگ و گلے بسنداں

میں ایران گیا
مگر دل کی بھیگ مانگتا ہوا
کاہلی فقیر دل کی طرح
ہر جگہ گیا۔ (لیکن، موت نہ ملی
اور، نہ ہی دل کا درد ماں نصیب ہوا)
میں نے ایسا دلبر نہیں دیکھا
جو مہرک کا ثانی ہوتا
انہوں اس پری جمال کے لئے
جو اپنے گھر کی ملکہ اور اپنے گاؤں کا سنگار تھی
وہ بے مثال اور بے نظیر تھی
اب تک اُسے میں حاصل نہ کر سکا
میں باغ جہاں کے اس پھول کو
پانے کی تمنا دل میں رکھتا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مہرک کی بے وقت موت سے عزت چنگیزی کو صدمہ تو ہوا۔ لیکن اسے فرقت دائمی نے اس کے دل میں وہ مدوجزر کی کیفیت پیدا نہ کی جو محبوب کے زندہ رہتے ہوئے نہ ملنے میں ہوتی ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ جامِ دُرک کے یہاں جو سوز و گداز اور درد و غم کی تصویریں ملتی ہیں۔ وہ عزت کی شاعری میں مفقود ہیں۔ البتہ جامِ دُرک کے دل سوزاں کی آنچ مست تو کلی کے وجودِ معنوی میں آگ لگا دیتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری بوجی شاعری میں جامِ دُرک اور مست تو کلی کے رنگِ کلام میں بڑی مناسبت ہے۔ بشیر احمد صاحب لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں:۔
”در حدیث — جام نے آگ جلائی، اُس کے دھوئیں میں مست تو کلی نے جو باتیں محمدانِ گنگوری کے ساتھ کی ہیں، وہ جام کی بڑائی کو ظاہر کرتی ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جام کی شاعری قیاس سے بالاتر ہے۔ یہ اُس زمانے کی باتیں ہیں، جب مست تو کلی رات کہیں، دن کہیں پھرتا تھا کبھی سب کے میدان اور وادی میں، کبھی سلسلہ ہائے کوہستان مری میں، کبھی سندھ کے رگزاروں اور بازاروں میں، کبھی دیر سے کے منبرہ زاروں میں نظر آتا تھا۔ وہ اپنے دل کا رنگ صاف کرنے کے لئے سب میں محمدانِ گنگوری کے یہاں ٹھہرا۔ جو خود ایک بڑا زبانِ داں شاعر تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اشعار سنائے (محمدانِ گنگوری کا بیان ہے مترجم، جب مست تو کلی کوئی شعر سناتا تو جام کا نام ضرور لیتا اور یہ بتاتا کہ یہ آگ جام کی لگائی ہوئی ہے۔“

جام دُرک اور مست توکلی میں قدر مشترک کیا ہے؟ یہ مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ نیز مست توکلی کی عشقہ شاعری میں جو سوز و گداز اور محبب سے جدائی کا غم پایا جاتا ہے اُس میں اور جام دُرک کے انداز بیان اور موضوعات میں یکسانی اور بُعد کیا ہے؟

مست توکلی کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ نہ صرف بوجی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر ہے، بلکہ ایک دردِ لیش و صوفی بھی ہے، نیز ہمیں یہ بھی علم ہے کہ اُس کی شاعری کا محور ستم — واقعی گوشت و پوست کا عصبہ تھا۔ لیکن جیسا اُس کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے، اُس کے مجازی عشق نے تیزی کے ساتھ حقیقت سے رجوع کر لیا۔ لیکن یہ صورت جام دُرک کے یہاں نظر نہیں آتی۔ گو وہ بھی بوجوں میں دلی مانا جاتا ہے، مست توکلی کے متعلق برادرِ انجم قزلباش رقمطراز ہیں :-

”شرقی بوجوں میں مست توکلی کو نہ صرف عظیم شاعر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے سچا اور پاکیزہ عاشق اور پرہیزگار بزرگ سمجھ کر اُس سے بے پناہ عقیدت اور محبت کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ گو تو میں مست کا مزار آج بھی سینکڑوں عقیدت مندوں کی آماجگاہ ہے، جہاں مری اور دیگر قبائل کے افراد چڑھائے چڑھاتے اور منتیں ملتے ہیں.....“

..... توکلی کی پیدائش کی صحیح تاریخ اور سال کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اکثر بڑے پورھوں کا خیال ہے کہ اس نے ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ایک غریب اور نادار گھرانے

میں کوہلو کے مقام پر جنم لیا۔ اس کے والدین مری قبیلہ کی شیرانی شاخ سے تعلق رکھتے تھے *۔ (امروز ۲ دسمبر ۱۹۵۶ء) میرے خیال میں عموماً شاعری کی ابتدا گو عشق مجازی سے ہوتی ہے، لیکن بعد میں شاعر کے نا اُسودہ جذبات اور شکستِ انا۔ اُسے اصل حقیقت ”یا حسن مطلق“ کی تلاش کی جانب مائل کر دیتے ہیں، جسے لوگ روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر شاعری کا معاملہ اس قدر نازک ہے کہ تفسیر و تعبیر مختلف رنگ میں کرنے کی گنجائش رہتی ہے۔ اور حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے اس طرح لپٹے ہوتے ہیں جیسے رات سے دن، اور دن سے رات، بہر کیف جہاں تک نا بصوری، عشق، نوائے فراق اور دردِ مہجوری کے اظہار کا تعلق ہے جام دُرک اور مست توکلی کی لئے مل جاتی ہے۔ اور وہ بقولِ نظیر اکبر آبادی اس حسنِ امتزاج کے ساتھ ہے

جتنے میں کشتگانِ عشق اُن کے ازل سے ہیں

اشک سے اشکِ غم سے نمِ نمون سے خونِ گل سے گل

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جام دُرک کے دل کی دھڑکن مست توکلی کے دل میں سما گئی ہے۔ دونوں کے رنگ میں بڑی مناسبت

پانی جاتی ہے۔ مست تو کلی کہتا ہے۔

دوست منی درین اے کو شیتھ من آبندیں کہکھ اں
چلیک اں جتناں چو ساوالی آف بندیں جھڑاں
ترجمہ: میرا دوست بادل کی طرح حسین ہے۔ رات کے وقت اس کی جھلک ایسی ہی معلوم پڑتی
ہے جیسے پانی سے بھرا ہوا بادل دھپک رہا ہو۔
مست تو کلی جام دُرک ہی کی طرح اُمیر باد کا خیر مقدم کرتا ہے۔

”اے ہوا! تیرا چلنا مبارک ہے
تیرے چلنے سے مجھے سرور پہنچتا ہے
چونکہ تو میرے دوست کی طرف سے آتی ہے“

”میرا دوست خم شیر اُبار ہے
میرا دوست اُہو کی طرح وحشت زدہ ہے
اور مجھے دیکھتے ہی چونک اُٹھتا ہے
اس کا چہرہ نفع فروزاں کی طرح روشن ہے
میرا دل اُس وقت افسردہ ہو جاتا ہے
جب میرا محبوب میری طرف ملتفت نہیں ہوتا۔“

جی ہے گوات کہ تُو کسے کا ہے
تر منی جان تُو شر و سیبا ہے
کہ تُو تُو فی دوست و پلوئے کلی ہے
مست تو کلی کے محبوب کا سراپا! اس خط کیجئے۔
روز انت چو کُندھی اں بہو خیں اں
برنت چو اُہوال تر بہو خیں اں
رُوخ انت چو ڈلو اں بہو خیں اں
دل منی مینا بی ہوال ردشی
براوہنیرار بنت مست و مدہوشی

مست تو کلی ایک جگہ کہتا ہے۔

”محبوب جب خمار اُگیں نگاہیں اُٹھاتا ہے
تو بقرار عاشق بھی بیدار ہو جاتے ہیں“
مست تو کلی کا انداز بیان اور اس کا رشتہ جام دُرک سے استدار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اب ایک پوری
نظم کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی پرواز تخیل اور امیجری پر غور کیا جائے۔ مست تو کلی فرماتے ہیں۔

”کوئیں سندھ سے موسم گزار کر لوٹ رہی تھیں
میں نے ان کو نجوں کی ڈال سے رفاقت اختیار
کی۔“

”کوئیں کی آواز سے میرے دل کا دریاں نہ ہوا
سیر بقرار دل کا دریاں محبوب کا شیریں تیش ہے“

لانت کنت چماں پُر خماریں اں
عاشق اں جاگنی بے قراریں اں
مست تو کلی کا انداز بیان اور اس کی پرواز تخیل اور امیجری پر غور کیا جائے۔ مست تو کلی فرماتے ہیں۔
کوئیں سندھ سے موسم گزار کر لوٹ رہی تھیں
میں نے ان کو نجوں کی ڈال سے رفاقت اختیار
کی۔

کوئیں کرا مت مئے دل و درماں نہ بنت
مئے دل و درماں متعل بر و شیریں کند گنت

دیتے من سمو کر کنت گنتائیں گداں
تنگو میں بچی اُستگ گور عاریفیں پیاں
سست و لور گون انت گوں کہنی کو تراں
کو نجاں قطاریں من گوے قطار و رواں
کو نچ پر بال و من پر اپا دو گام اتاں
کو نچ پر سیل و من پر سمو و گندگ و

کو نچ گوزنت دیم و من پر سیوی تاحیراں

میں نے اپنی محبوبہ کو دیکھا جس کے جسم پر رنگدار لباس تھا
سہرا رنگ کا بچہ اُس کے پاس ہی تھا
خوام یا رکاز اندازہ سبز کوثر کی رفتار سے کیا جاسکتا ہے
کو نچوں کا ایک جھنڈ جارا ہے میں اس کے ساتھ ہوں گا
کو نچیں پرواز کرتی جائیں گی میں پیدل جاؤں گا
کو نچیں سیر کے لئے جائیں گی میں اپنے محبوب کے دیدار کیلئے
کو نچیں آگے گزر جائیں گی اور میں رہی میں پھیر جاؤں گا

اہل نظر اور صاحبانِ دل مندرجہ بالا مثالوں سے مست تو کلی اور جامِ دُرک کے رنگِ کلام سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں
اور اس قدر مشترک کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو ان دونوں شاعروں کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ جامِ
دُرک کے اشعار ملاحظہ کیجئے :-

او سہیں بے پرس و بہشتی و
اش لطیفانی نیغاں کاہیے
من گل و دیم و میل کتھ دوشی

”اے بادِ نسیم!
تو بلا کسی احتساب کے بہشت کی حقدار ہے
کیونکہ تو میرے محبوب کی سمت سے آئی ہے
اور تو نے میری محبوبہ کے چہرے سے مس کیا ہوگا“

یہ اشعار بعض گویے یوں بھی گاتے ہیں :-

جی سہیں بے پول و بہشتی و
اج لطیف و تو پھلو و کاٹے
گوں گل و دیامیل کتے دوشیں
بوسے شہ سیکاں زریگے و شیں

”اے بادِ نسیم!
بغیر کچے تو حقیقت ہے
کیونکہ تو میرے دوست کی طرف سے آئی ہے
رات تو نے اس کے چہرے سے مس کیا ہوگا
اور اس کے زلفوں کی خوشبو سے خود کو بسایا ہوگا“

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے بشیر صاحب نے ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

”لوگ بادِ نسیم کو قاصد بنا کر اپنے دوست کو نامہ و پیام بھیجتے ہیں۔ لیکن جامِ بادِ نسیم سے
اپنے دوست کی خوشبو سونگھتا ہے۔ وہ بادِ نسیم کو قاصد نہیں بناتا۔“

افس! بشیر احمد صاحب لطیف بیان کا مزہ نہ لے سکے۔ شعر کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور سخن فہمی ایک عطیہ خداوندی
ہے۔ پھر جام کے ہاں الفاظ کا درو بست اور استعارے کچھ اس انداز سے آئے ہیں کہ مفہم تک پہنچنے کیلئے پہلو دار
راہوں سے گزرتا پڑتا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ کتنے غیر محسوس طور پر جامِ دُرک نے بادِ نسیم کو قاصد قرار دیا ہے۔ بادِ نسیم تو

خود قاصد بن کر آئی ہے۔ گو وہ نامہ بے جان اور پیام مہفوف حروف لے کر نہیں آئی تو کیا ہوا، وہ زلف یار کی خوشبو اپنے ساتھ لائی ہے۔ شب گزشتہ کی صحبت کی یاد رنگین لائی ہے جس سے کیف و سرور کا عالم پیدا ہو گیا ہے۔ خوشبو سے پرہیز یار نہایت بلیغ استعارہ ہے اور جامِ درک ایسے قاصد کے لئے کہتا ہے کہ وہ بے محاسبہ جنتی ہے۔ جامِ درک نے نہایت بلیغ فصیح انداز اختیار کیا ہے جس کی مثال شاید ہی کسی زبان و ادب میں مل سکے گی۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ بادِ نسیم محبوب کی جانب سے آرہی ہے، ظاہر ہے کہ وہ محبوب کے مودبن سے مس ہوئی ہے اور پھر وہی بادِ نسیم جامِ درک کے جسم و جاں میں اکر سرایت کر رہی ہے۔ یہ تو وہاں محبوب کا ایک چھوٹا انداز ہے اور اس کی شرح میں دفتر کا دفتر بھی رنگین کر دیا جائے تو حق داد ادا نہ ہو سکے گا۔ یہاں پر یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ اردو اور فارسی شعرا کے یہاں بھی ”بادِ نسیم“ سے پیامِ رسانی کا کام لیا گیا اور بڑے بڑے مضامین باندھے گئے ہیں۔ لیکن جامِ درک کی شان کچھ اور ہے۔ پھر ان اشعار میں جو الہانہ اور وجد انگیز کیفیت پائی جاتی ہے وہ جام کے اسوہ کسی کو نصیب ہوا ہے حافظ کی سرستی بھی بہت ہی نظر آتی ہے۔ بادِ نسیم جامِ درک کی وادی جاں میں اتر کر ایک اتھرازی کیفیت پیدا کر رہی ہے اور صحبت گزشتہ کی یادیں اُس کے سامنے ایک پیکرِ حقیقی بن کر اکھڑی ہوئی ہے۔ اور وہ کچھ دیر کے لئے قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زلفِ عنبریں کی خوشبو سونگھتا ہے۔ محبوب سے لطف ہم آغوشی اٹھاتا ہے۔ اور غمِ فراق کی شامِ کدورت اور تکانِ محبوب کی نگاہِ لطف و کرم سے ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک عالمِ سرخوشی و سرشاری میں بادِ نسیم سے مخاطب ہوتا ہے:-

ارسمیں بے پرسوں و بہشتی و
اش لطیفانی نیتاں کاٹے
من گلِ بر دیم و میل کتھ دوشی

ست تو کلی کو بخوں کے اڑتے ہوئے جھنڈ کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہے اور دیا درِ محبوب کی جانب روانہ ہوتا ہے تو اڑتے ہوئے بادلوں کے گلے جامِ درک کے صبر و قرار کو ٹوٹ لیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

بے قراراں من نیم شفقی پاساں | نیم شب کے وقت مجھے اپنے دوست کی محبت کے خیال نے
پر و تنی دوست بر حبِ اخلاصاں | اور اُس کی وفاؤں نے بے قرار کر دیا۔

ست تو کلی اور جامِ درک کی مرقع نگاری جدا گانہ ہے۔ لیکن اس میں دونوں نے خونِ جگر سے رنگ بھرا ہے۔ لہذا ان دونوں کے دل کی دھڑکنیں بڑی ہم آہنگ ہیں۔ پھر ایک مخصوص قسم کی دلہانہ کیفیت اور بے خودانہ اندازِ بیان دونوں شعرا کے یہاں موجود ہی ہے۔ جامِ درک کہتا ہے:-

میں دل جوڑتہ ڈیل و تئی و | میرے دل نے تیرا قد و قامت تراشا ہے
یہ تو اسکو پٹ چرخیں | تو میدان میں چرنے والا ہرن بن جا!

منت تو بچہ بال، پہنار گر و خیں
 بیئے تو بارگیں تازی تشو خیں
 منت از وار بال چاکب بخو خیں
 بیئے پچھے کہ من پٹ و رو خیں
 منال بینگ مسک دم کنو خیں
 ہو پچھیں و دپ و درس و گر و خیں

میں شکاری بن کر تیری گھات میں رہوں
 تو عبا ز فناد نازی بن جا
 تو میں تجھ پر سوار ہو کر چاکب لگنے والا بن جاؤں
 تو، میدان میں آگاہ ہوا پھول بن جا
 تو، میں شہد کی مکھی بن کر جھنڈاؤں
 اور یوں اس پھول کا منہ چوم لوں !

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کون اس مجموعہ حسن و خوبی سے ملا ہے، اور کسے مہلت دید نصیب ہوئی ہے۔ وہ جلوہ حسن ہزار در ہزار حجابات میں رہتا ہے۔ ہر دل میں اُسے دیکھنے کی تمنا اور ہر سر میں اُسے پانے کا سودا ہے۔ لیکن سعادت وصال کسے نصیب ہوتی ہے۔ اور جنہیں ہوئی، اُنہیں پھر اتنا ہوش ہی کہاں رہا کہ ذکر محبوب سے دنیا کو آگاہ اور اُس کے قد و قامت کی رعنائی و دلنرمی سے مطلع کرتے۔ جنہیں وہ مل گیا، وہ خود کھو گئے۔ ہاں جنہیں تمنا رہی اور اُسے برکل پانے سکے، اُنہوں نے طرح طرح کے قد و قامت تراشے ہیں۔ کہیں مونسو دڑو کی رقاصہ کے لہجے اور آئینہ جہانی اور کیفیت وجدانی میں، تو کبھی الورا اور اجنتا کے غاروں میں۔ کبھی پو مپانی کے عجبہ میں، کہیں ابو اہول کی شکل میں۔ اور کبھی دید کے اشلوک، اپنشد کی معرفت اور منصور بن حلاج کے اعلان انا الحق میں۔ کبھی حافظ و سعدی، میرو غالب، اقبال و عارف کے ذوق نغمہ گری میں۔ کبھی شہ مرید، شہ داد، عزت پنجگوری، مست توکلی، رحم علی کی داستان سرائی میں۔ قد و قامت، شاعر، مصور، ہنگ تراش، موسیقار اور جملہ فنون لطیفہ کے تخلیق کنندہ اپنے اپنے دل ہی سے جوڑتے ہیں۔ جس مجموعہ حسن و خوبی کی ایک ادا پر وہ نقد دل تیار کر چکے ہوتے ہیں، وہ ایک لمحہ کے بعد وہ کہانی رہتا ہے؟ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو خبر ہے کہ لینارڈ ڈی ویسی (ایک اطالوی مصور ۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۹ء) مونا لیزا نامی ایک عورت کی مسکراہٹ پر اس طرح فریفتہ ہوا کہ اُسے زندہ جاوید بنانے کی ٹھانی، لیکن مونا لیزا کو اُسی انداز سے مسکراتے ہوئے دیکھنے کے لئے اُسے چوبیس سال حاضر باش رہنا پڑا۔ اور چوبیس سال کے بعد دوبارہ جب وہ اُسی انداز میں مسکرائی تو لینارڈ ڈی ویسی نے تصویر ختم کر لی۔ وہ عہد ختم ہو گیا۔ مونا لیزا اور لینارڈ ڈی ویسی کی ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی۔ لیکن یہ شاہکار "مونا لیزا" آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور اُس کے مورتوں پر مسکراہٹ نہیں، بلکہ چہرے کے ہر مؤثر بن سے مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اور آنکھیں تک مسکرا رہی ہیں۔ یہ ایک فن کار کی شان ہے اور جامِ دُرک بھی اسی پایہ کا فن کار ہے۔ لہذا جب وہ یہ کہتا ہے

”منی دل جڈتہ ڈیل و تئی و“

”یہ لفظ بینگ (بے ی، ن غنہ گ) معنی کتا نہیں ہے بلکہ بینگ (بے، ن، گ) معنی تھپ ہے۔ ”درس گر و خیں“ معنی بوسہ لینے والا۔

یعنی میرے دل نے تیرا قد و قامت تراثل ہے تو اس میں مبالغہ کا ثابہ بھی نظر نہیں آتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ کا عام رواج کے مطابق اپنے کلام میں نام نہ لیا۔ کیونکہ یہ تو اُس کے دل کی تصویر تھی، جو حسن کی جستجو میں نکلا تھا، وہ حسن، جو خیر مطلق ہے!

جام دُرک بلوچی زبان کی عشقیہ شاعری میں منفرد مقام رکھتا ہے اور اس کی شاعرانہ بلندی کو ہنوز کوئی دوسرا شاعر نہیں چھو سکتا۔ رست تو کھلی نے جام دُرک سے اکتساب کیا ہے۔ لیکن اُس کے کلام پر مقصودانہ رنگ غالب ہے۔ جام دُرک کی انفرادیت، زبان کی پاکیزگی، اسلوب کی رنگینی اور مشاہدات کی ندرت کے ساتھ ساتھ اُس کے دل حوال زدہ کی لالہ کاری سے ترکیب نشو و ارتقاء پاتی ہے۔ جو صد مہ فراق سے خوںچکاں ہے۔ لہذا اس کی شاعری اپنے عہد میں بھی پسند کی گئی اور اُسے ملک الشعراء مانا گیا۔ اور دورِ حاضر میں بھی وہ نوجوان شاعر دل کا محبوب ہے۔

گالوں کو شتغنت

دروں سپتغنت

لعلوں ریتغنت

اختتامیہ

الحمد للہ! ذکرِ محبوب تمام ہوا۔ لیکن زبانِ ثنائوں کو گلہ و اماندگی نہیں۔ اور نہ بیانِ قصہ بے ستون و کونین کی تجدید ممکن ہے۔ جی چاہتا ہے۔ از سر نو پھر اسی پیکرِ محبوبی و حسنِ خوبی کا ذکر چھیڑ دیں، جس کی صورت گری کی ابتدا امداد میں ہوئی تھی اور جس کی بارگاہ میں ادا و خوجون تک عموماً گزارا ہوں۔ اس کے ایک ایک جلوے سے نگاہِ تشنہ کو سیراب اور دل ویراں کو آباد کیا ہے۔ بہت کچھ کہنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نہیں لکھا۔ اس وقت ایک ثنائی جج کے یہ الفاظ تحتِ اشعر میں ارتعاش پیدا کر رہے ہیں:-

”میں کسی ایسے مصنف کو نہیں جانتا جو اپنی کتاب کی عین تکمیل کے وقت یہ کہنے کے لئے تیار نہ ہو کہ کاش میں اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ادا کر سکتا، تو یہ بدرجہا بہتر ہوتا۔ اگر فلاں بیان اس میں شامل کیا جاسکتا تو یہ تصریح کسی قدر واضح ہو جاتی، اگر ان الفاظ کو آگے لایا جاتا، تو بہت سوزوں ہوتا۔ اگر فلاں فلاں فقرے قلم زد کر دیئے جاتے تو عبارت زیادہ چست ہو جاتی۔“

قلبِ مکے، حقیقی ثنائی جج کے ان تاثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

”اس قسم کے تجربات میں ایک بڑی موعظت ہے جو اس حقیقت کی شہادت دیتا کرتی ہے کہ خامی انسان کے تمام کاموں کی خصوصیت ہے۔“

لہذا یہ دعوئے باطل ہو گا کہ جامِ دُرک کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور کلام پر یہ جامع تبصرہ تنقید و تنقیح سے کسیر پاک ہے۔ البتہ یہ عرض ضرور کروں گا، کہ ایک ایک لفظ کو قول قول کر لکھا ہے اور اس بات کا کمال احتیاط و احتیاط کیا ہے کہ ہر روایت و بیان کے ماخذ کی صراحت کر دی جائے۔ بہت سی متنازعہ فیہ روایتیں اور شخصی بیانات محض اس لئے شامل نہ کئے کہ وہ اصولِ روایت اور اسناد سے عاری تھے۔ البتہ کہیں کہیں بسبیل تذکرہ حاشیہ میں اس کی جانب اشارہ کر دیا ہے تاکہ اس موضوع پر بعد میں قلم اٹھانے والے حضرات رجوع کر سکیں۔

کلامِ جام کے ترجمے پر خاص توجہ دی گئی ہے اور لفظی ترجمے کے بجائے اصل مطالب کو صاف و شستہ اور عام فہم زبان میں ادا کیا گیا ہے۔ اصل بلوچی متن اور ترجمے پر ملک محمد پناہ صاحب اور ملک فیض محمد صاحب نے بے لوث نظر ثانی فرمائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تمام نقائص کی ذمہ داری کا میں تنہا ذمہ دار ہوں۔ لہذا ناقصانِ فن سے انتہاس ہے کہ تنقید و تنقیح کئے وقت مجھ جانِ ناقص ہی کو ہدفِ ملامت بنائیں تو بہتر ہو گا۔

جہاں تک کلام جام کے املاء کا تعلق ہے اسے شرقی بلوچی میں املاء کیا گیا ہے۔ اور کیانی املاء کا کمال لحاظ رکھا گیا ہے۔ البتہ دوسرے شعراء کے کلام میں املاء کا یہ التزام نہیں کیا گیا۔ نیز متعدد متنوں سے مقابلے اور اپنے فہم و فراست کے مطابق تحلیل و تجزیے کے بعد اصل بلوچی متن کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ بعض مقامات پر حاشیے میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جام کے والد بزرگوار کا نام دُرک دُند، موتی، اور دادا، یا جد میں سے کسی کا نام کر مو (یا کرم خاں) تھا، محض ایک روایت ہے۔ قطعیت کے ساتھ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ میروزنی شاخ دوسری کا شجرہ دیکھنے کے بعد کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا ممکن ہو سکے گا۔ ملک محمد پناہ صاحب نے راقم اسطور کو مطلع کیا ہے کہ:

میرے نزدیک شاعر کا نام دُرک ہو گا اور تخلص جام۔ جو کر مو کا فرزند ہے جام کا ترجمہ میرے نزدیک آپ کا معروف "جوانِ رعنا" ہے۔ جیسا کہ "بشیریں دوستیں" والی نظم میں آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا۔

زندگی انت متی و ڈیرو : گواہرام منی جا میں بل
اکثر پڑنے بلوچی اشعار کو باریک بینی سے کھنگالاجائے تو شاید جام کا استعمال کہیں اور بھی دستیاب ہو جائے۔

غرض تحقیق و تدقیق کے بعض گوشے تشہ تکمیل میں۔ اور جب تک تمام تصفیہ طلب معاملات کے حق میں مثبت اور ناقابل تردید شہادتیں جہیانہ ہوں، اُس وقت تک شرعیں مختلف ہوتی رہیں گی۔ راقم اسطور نے اس سلسلہ میں دوسری قید کی شاخ میروزنی کی روایت نقل کی ہے اور یہ اُن کا دعویٰ ہے کہ جام کے والد بزرگوار کا نام دُرک اند دادا کا نام کرم خاں ہے۔ یہ کیف یہ رسالہ محض خود فکر کا ایک سانچہ، ایک ادبی تنقید کا نمونہ اور مزید خود فکر کے لئے ایک ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے، حرف آخر نہیں! لہذا ہمیں غور و فکر کرنا چاہئے۔ اور مصدقہ معلومات کو منظر عام پر لانے میں بعض مناسب نہیں۔

بشیر احمد، امیر عثمان، امان اللہ چکی، سلیم گئی اور گل خاں نصیر میرے احباب خاص ہیں اور ان حضرات کی محبت کا قدردان ہوں۔ لیکن ادبی تنقید و تبصرہ اور تحقیق و تدقیق میں ذاتی رشتہ و روابط حائل نہیں ہو سکے۔ ایک مصنف کی کسی تصنیف میں براہ راست یا بالواسطہ اتنے احباب حصہ دار بن جاتے ہیں۔ جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ لیکن بعض اسماء گرامی کی مجبوری میری اس تصنیف پر واضح طور پر نظر آئی گی۔ برادر م صلاح الدین ندیم، عبدالمبین عارف، ڈاکٹر

سید عبداللہ، رفیق رازد، مولانا غلام رسول مہر، رئیس احمد جعفری، نجمہ جلالی اور عابد علی عابد کی ہمت افزائی اور بالواسطہ
مباحثہ مجھے بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ نیز اس ضمن میں مجھے ان حضرات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ جن کی
ستم ظریفانہ دل شکنی نے ایشیہ قلم پر تازیانے کا کام کیا ہے۔ ان حضرات میں مولانا صلاح الدین، مدیر ادبی دنیا لاہور
سید ابو ظفر زین، مدیر مغربی پاکستان، لاہور، اور ایم فضل امام (انچارج میگزین سیکشن روزنامہ سول اینڈ ٹری گزٹ
لاہور) خاص ہیں۔ شاگردان رشید میں محمد اقبال براہوئی بانی، محمد طارق، سید ذاکر حسین، نعمت اقبال، محمد اعظم
مس اہیا براؤن، مس شاہدہ اور محمد تحسین کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اس دور میں قدیم روایت شاگردی کو ان عزیزان
گراہی نے اس حسن دغوبی سے نبھایا ہے کہ میں خود بھی حیران ہوا ہوں۔ اس کسبے میں ان کا احسان مند ہوں، کہ یہ
پیکر ان اخلاص میرے ہی اخلاق و کردار کے پر تو ہیں۔

مجھی سے ہے طلب گاہ پرستش

میرے ذوقِ نظر کا آفریدہ

سردق عزیزم عبد الرؤف کے ذوقِ جمال اور اس احساسِ جمیل و محبت کدہ لگوں سے آراستہ ہوا ہے جس کے سامنے
نقشِ ہزار بھی بے حقیقت بن جاتا ہے۔ میں اُن کی دلہاری و دلجوئی کی کس کس ادا کو جھٹلاؤں گا! دُعا ہے کہ خدا اس
حقیقت و اُلفت کو استحکام بخشے۔ جو انہیں اس فقیر سے ہے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ میں نے ایک ایسے بوجھ کو اپنے سبک کاندھے پر اٹھایا ہے جس کا میں اہل نہیں۔ میں
ذاتِ باری تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں کہ اُس کے فیوض و برکات سے حتی المقدور اس گراں بار ذمہ داری سے عہدہ برآ
ہونے کی سعی کر سکا ہوں۔ عمن و قبح پر تنقید و تبصرہ فرمائیے تاکہ افسانہ ناتمام کی تکمیل ہو۔

ابھی ایک اور شخصیت نہاں خانہ ذہن سے اُبھر رہی ہے، جس کی نگاہ کیسی صفت، التفاتِ حقہ اور اخلاص
دوستانہ کی قدر دانی الزم ہے۔ یہ مولانا نور احمد خاں فریدی ہیں۔ جو نہ صرف اس کتاب کے پبلشر ہیں، بلکہ بلوچیت
کے ایک زندہ پیکر اور فقر و خدمت کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ گزشتہ سولہ سترہ سال میں میری گنہگار آنکھوں نے
عجیب و غریب تماشے دیکھے ہیں۔ کتنے لوگ بلوچوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے اُٹھے اور رقمِ خلیفہ چنہ کرنے کے
بعد حجابِ آسا بیٹھ گئے۔ خود بیگ بیگی اعلیٰ حضرت خان معظم احمد یار خاں نے لاکھوں روپے بلوچی زبان و ادب کی
ترویج و ترقی کے لئے عطا کئے۔ لیکن اس قومی فنڈ کو لوگوں نے اپنی ذاتی آسائش پر صرف کیا۔ اور کوئی ایسا کام نہ کیا
جو مقصودِ اولیٰ کے لئے مؤثر ہوتا۔ ان تمام معتبرین کے برعکس مولانا نور احمد خاں فریدی قابلِ مبارکباد ہیں کہ
وہ نہ صرف قوم کے لئے شبانہ روز کوشاں ہیں، بلکہ اپنی حلال کمائی کا معتد بہ حصہ قومی مہنامہ "بلوچی و نسب" کی
تذکرے

میں ذاتی طور بھی ان کا شکر گزار ہوں کہ اُن کی قدر دانی اور بلند حوصلگی کی وجہ سے میں اپنے مقالات و بطورِ ثقافت ہنر

قدیم یوسفستان نمبر بروج قبائل اور جام دُرک، منظر عام پر لا سکا۔ جو بصورت دیگر اپنے مولد ہی کو مدفن بنالیتے جیسا کہ
 براہوئی زبان و ادب پر ہماری تحقیقات کا حشر ہوا۔ اور یہی وہ وجہ ہے کہ بعض احباب اور پیشرز کے اصرار و غفلت
 کے باوجود میں "جام دُرک" مولانا کے گرامی ہی کی تذکرہ ہا ہوں، کہ ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔
 گلِ فشانہ نہ بستر ہم چوں عرقی و من
 مہکتِ نخس جینم و بر بسترِ خواب اندازم

ختم شد